اِسلامی بم کا خالِق کون

مبین غزنوی

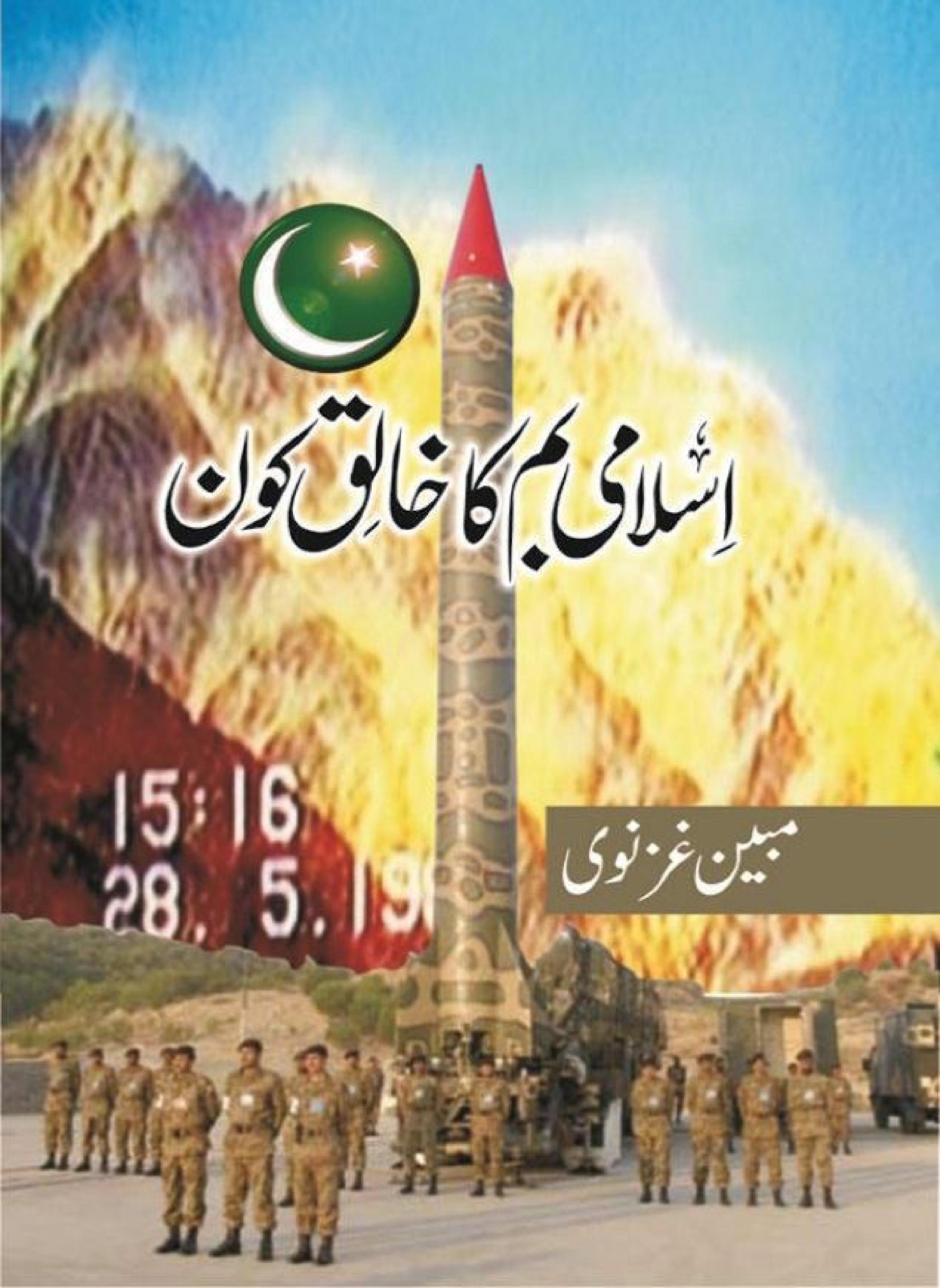

حوالہ جات

ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور اسلامی بم — از: زاہد ملک

ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ایٹمی پاکستان — از: شاہد نذیر چوہدری

محسن پاکستان کی ڈی بریفنگ — از: زاہد ملک

روزنامہ ''نوائے وقت''

روزنامہ ''جنگ''

کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے، ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔

اگر **آپ** ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود ADs کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجیے، آپکی یہی مدد کافی ہوگی۔

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف **آپ** بہتر بنا سکتے ہیں۔

اسلامی بم (پاکستانی ایٹم بم) کی تخلیق کی کہانی اور اصل خالق کی حقیقت سے پردہ اٹھاتی ایک چشم کشا تصنیف

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

اسلامی بم کا خالق کون؟

مصنفین

مبین غزنوی

محمد عبداللہ گل

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔اُردو بازار، لاہور

فون:042-37352332-37232336

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب .... اسلامی بم خالق کون؟
مصنف .... مبین غزنوی
ناشر .... گل فراز احمد
علم و عرفان پبلشرز، اُردو بازار لاہور
مطبع .... زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت .... مئی 2011ء
قیمت .... -/300 روپے

ملنے کے پتے......

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور
فون: 7352332-7232336

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرما دیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ (ناشر)

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

انتساب!

آبروئے صحافت ۔۔۔ فخرِ پاکستان

جناب زاہد ملک صاحب

(ایڈیٹر انچیف ڈیلی پاکستان آبزرور)

کے نام ۔۔۔

جنہوں نے اپنی کتابوں اور اخبار سے نیوکلیئر پروگرام کی حفاظت کی اور پاکستانی قوم کو اس عظیم تحفے کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کیا۔

خدائے بزرگ و برتر ان کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین!

مصنف مبین غزنوی محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ساتھ

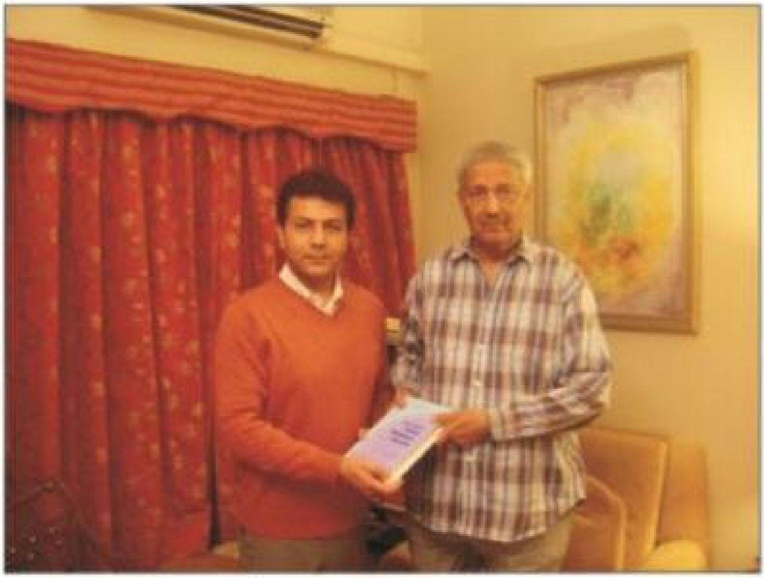

ڈاکٹر عبدالقدیر خان، عبداللہ گل چیئر مین محسنانِ پاکستان فاؤنڈیشن کو کتاب کا تحفہ دیتے ہوئے

مصنف مبین غزنوی محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے

مصنف مبین غزنوی محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے

مصنف مبین غزنوی جنرل (ر) حمید گل سے گفتگو کرتے ہوئے

مصنف مبین غزنوی محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے

فہرست

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

		صفحہ
❁ پیش لفظ		09
❁ مقدمہ		10
❁ باب اوّل		
	ایٹمی پروگرام کا آغاز	12
❁ باب دوم		
	کہوٹہ مکمل پاکستان کوشش	22
❁ باب سوم		
	جذبہ حب الوطنی کی دلربا داستان	43
❁ باب چہارم		
	غوری میزائل	68
❁ باب پنجم		
	ایٹمی دھماکے	78
❁ باب ششم		
	اسلامی بم کے خالقوں کے اثاثے	91
❁ باب ہفتم		
	پتھر بولتے ہیں	96
❁ باب ہشتم		
	شخصیت	109
❁ حوالہ جات		112

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

پیش لفظ

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم آج بھی صلاح الدین ایوبی یا محمود غزنوی کے دور میں پہنچ گئے ہوں۔ ایک ایسا ملک جو سوئی تک نہیں بنا سکتا اس نے آخر کیسے ایٹم بم بنا لیا۔ شروع دن سے ہی پاکستان کا نیوکلیئر پروگرام مختلف سازشوں کا شکار رہا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بھارت کے ہوائی اڈوں پر اسرائیلی جنگی جہاز کہوٹہ پر حملہ کرنے کے لئے تیار کھڑے تھے اس سازش کے تانے بانے کیا تھے۔ میں نے اس حوالے سے تمام حقائق واضح کر دیئے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب نوجوان نسل کو اپنے عظیم ایٹمی پروگرام کے اصل خالق اور ان کے رفقاء کے کردار سے آگاہ کرے گی اور خاص طور پر ایٹمی پروگرام کے اصل کرداروں سے بھی آپ آگاہ ہوں گے۔ میں آخر میں نوجوان طبقے سے گزارش کروں گا کہ وہ سائنس اور تعلیم کے دیگر شعبوں میں ترقی کریں اس حوالے سے محسنِ پاکستان فاؤنڈیشن کے کسی بھی تعاون کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔ برادرم عبداللہ گل کا اس کتاب کی تیاری میں کلیدی کردار ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کے اصل مصنف بھی وہی ہیں لیکن نجانے کیوں انہوں نے اپنے ساتھ میرا نام بھی دینا مناسب سمجھا۔

اللہ تعالیٰ آپ کے حامی و ناصر ہوں

مبین غزنوی

راولپنڈی

0300-4553509

مقدمہ

برادرم مبین غزنوی نے حکم دیا ہے کہ انکی کتاب ''اسلامی بم کا اصل خالق کون؟'' کا مقدمہ میں لکھوں میرے ذہن میں پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کی تاریخ گھومنے لگتی ہے کہ کس طرح اور کن کٹھن حالات میں پاکستان ایٹمی قوت بنا۔ بلاشبہ پاکستان کا ایٹمی قوت بننا تاریخ اسلام کا ایک درخشاں باب ہے۔ ہم اس پر جس قدر فخر کرسکیں وہ کم ہے۔ آپ ذرا سوچیئے کہ جب سقوط ڈھاکہ کے بعد بھارت ہمیں بھی شودروں جیسی قوم سمجھ رہا تھا اور آئے روز ہم پر یوں بیان آلاپ رہا تھا کہ جیسے ہم ان کے غلام ہوں۔ پاکستان پر حملہ کرنے کیلئے بھارت اپنی فوجوں کو بھی الرٹ کر چکا تھا۔ تو ایسے میں ہمارے اداروں کی توجہ ''پاکستان اٹامک انرجی کمیشن'' کی جانب تھی کہ شاید یہ کوئی معجزہ دکھائے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ایٹمی توانائی کمیشن میں اول تو اتنی اہلیت ہی نہیں تھی کہ وہ قوم کو کوئی خوشخبری سنا سکیں اور دوسری بات یہ کہ ان میں اکثر لوگ ایسے تھے کہ جو مغربی ممالک کے آلہ کار تھے۔ زیر نظر کتاب میں اس حوالے سے تفصیلی اور تاریخی شواہد درج ہیں، جب ایٹمی توانائی کمیشن کی طرف سے بھی مایوسی ہوگئی تو ایسے میں صرف اللہ رب العزت کی ذات ہی تھی جو وطن عزیز کا حافظ و ناصر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنی خصوصی رحمت کا نزول کیا۔ اور یوں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی صورت میں پاکستانی قوم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوئی۔ ڈاکٹر خان کی آمد کے بعد کمیشن کی سربراہی فرمانے اور پھر کمیشن سے مایوسی کے بعد ایک علیحدہ اور خودمختار ادارہ کے آر ایل بننے تک کیسے کیسے کٹھن اور ناقابل یقین مراحل درپیش آئے اس حوالے سے مبین غزنوی صاحب نے تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ ہماری نوجوان نسل کی طرف سے اپنے محسنوں کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے یہ کتاب آرہی ہے۔ کتاب میں خاص طور پر جس حوالے سے بحث کی گئی ہے وہ کہوٹہ دشمن لابی ''اندورنی اور بیرونی'' کی طرف سے محسن پاکستان ڈاکٹر خان اور نیوکلیئر پروگرام کے خلاف کی جانے والی سازشوں کا ذکر ہے۔ بلاشبہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام ڈاکٹر خان کا مرہون منت ہے۔ مجھے یہ بات لکھتے ہوئے انتہائی مسرت محسوس ہورہی ہے کہ برادر مبین غزنوی نے اس عظیم پروگرام کے ہر پہلو سے آگاہ کیا ہے اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے اصل خالق کے حق میں انتہائی شاندار دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ لیکن یہاں میں ایک بات کرنا چاہوں گا کہ اگر واقعی کمیشن نے کوئی کام کیا ہوتا تو کے آر ایل بنانے کی نوبت کیوں پیش آئی؟ اگر ڈاکٹر عبدالقدیر خان میں صلاحیتیں نہ تھیں تو پھر کیوں صرف انہیں کے لئے انہیں کے کہنے پر ایک الگ اور خودمختار اور اپنی نوعیت کے پاکستان کے پہلے حساس ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا......؟؟

دراصل پاکستان کے ایٹمی پروگرام اور ڈاکٹر خان کو بدنام کرنے کا فتنہ امریکیوں کا کھڑا کیا ہوا تھا۔ جس کے لئے انہیں منیر احمد جیسے ٹٹ پونجیے مل گئے۔ ان لوگوں نے کیا کیا گل کھلائے وہ اس کتاب کا حصہ ہیں۔ اس قضیے میں سب سے ذلیل انسان کا کردار پرویز مشرف نے ادا کیا۔

آپکو کتاب کے آئندہ اوراق بہت بڑے تاریخی حقائق پیش کریں گے۔ لیکن الحمدللہ تمام طرح کی سازشوں کے باوجود آج بھی پوری قوم

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اپنا ہیرو اور محسن سمجھتی ہیں۔ پوری قوم ان سے محبت میں اسی طرح ڈوبی ہوئی ہے اور محسن پاکستان فخر پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی اپنی قوم اور وطن عزیز سے محبت میں تو کوئی شک نہیں بلکہ اس قوم اور وطن سے محبت کے لئے سب سے بڑی قربانی بھی انہوں نے دی ہے بقول شاعر

میں اسیر غم ہجر ٹھہرا اور اس سے زیادہ کہوں کیا
مجھ کو جرم محبت میں یارو عمر بھر کی سزا ہو گئی ہے

خدائے بزرگ و برتر محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا سایہ ہمارے سروں پر تادم دیر قائم رکھے۔ (آمین)

محمد عبداللہ گل
راولپنڈی
۴/اپریل ۲۰۱۱ء
0364-4926262

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

باب اوّل

ایٹمی پروگرام کا آغاز

۱۔ بیٹا آنکھیں کھلی رکھنا
۲۔ ایٹمی توانائی کمیشن اور ڈاکٹر خان
۳۔ پراجیکٹ 706
۴۔ کہوٹہ دشمن لابی کے الزامات
۵۔ محسن پاکستان کا معجزہ

بیٹا آنکھیں کھلی رکھنا

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

گزشتہ چند مہینوں سے اہل علاقہ کے دل اور جذبات ایک انجانی خوشی سے لبریز تھے حالانکہ انہیں ذاتی طور پر یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ کیسی روحانی خوشی ہے لیکن ان لوگوں کے جذبات بالکل ایسے ہی تھے جیسے 65ء یا 71ء میں فوجوں کے قافلے گزرتے دیکھ کر چھوٹے بچوں کے جذبات ہوتے تھے شاید انہیں اپنے علاقے میں یوں پہلی مرتبہ پاک فوج کی غیر معمولی نقل وحرکت دیکھ کر فخر محسوس ہونے لگا تھا۔انہی دنوں ایک چرواہا جسکے والد صاحب مقامی مسجد کے امام تھے۔انہوں نے اپنے بیٹے کو کہا کہ ”بیٹا آنکھیں کھلی رکھنا“ دشمن بہت کمینہ ہے نہ جانے کب کوئی خباثت کردے۔

جی ہاں! یہ واقعہ پاکستان کے دارلحکومت اسلام آباد کے مضافات میں واقعہ علاقے کہوٹہ کا ہے۔اور اب کہوٹہ سے کون واقف نہیں! اور کیونکر واقف نہ ہو یہی تو وہ جگہ ہے جہاں پروطن عزیز کا سب سے قیمتی اثاثہ ”نیوکلیئر پروگرام“ اپنے پایہ تکمیل تک پہنچا۔کہوٹہ پراجیکٹ کے ابتدائی ایام میں ہی سیکورٹی حکام نے اہل علاقہ کو ہدایات دی تھیں کہ اپنے اردگرد نظر رکھیں ان لوگوں نے سیکورٹی حکام کی یہ بات آگے پہنچادی۔کہوٹہ کے امام مسجد کا بیٹا ایک دن اپنی بکریاں چراتے ہوئے اس پہاڑی پر بیٹھ کر ستانے لگا کہ جس پہاڑی کے نیچے سے ایک سڑک کہوٹہ پراجیکٹ کی طرف جاتی تھی اس نے یونہی بے خیالی میں اپنا چاقو نکالا اور ایک پتھر پر اسے رگڑنے لگا بکریاں چرانا تو شیوہ پیغبری ہے اور کہتے ہیں کہ چرواہوں کی چھٹی حس بڑی تیز ہوتی ہے۔شاید اسی لئے وہ لڑکا بھانپ گیا کہ چاقو رگڑنے پر پتھر سے کوئی غیر مانوس آواز آتی ہے اس نے وہ پتھر اٹھایا اور فوراً گھر لے جاکر اپنے والد محترم کے حوالے کرتے ہوئے نجانے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں کیا کہا کہ وہ پتھر کو لیکر سیکورٹی حکام کے پاس لے گئے۔الغرض جب اس پتھر کو متعلقہ حکام نے توڑا تو اس میں سے ایک ایسا آلہ برآمد ہوا کہ جو وہاں پر 60 کلومیٹر کے علاقے میں یورینیم کی آفزودگی کے متعلق معلومات اس پتھر کو رکھوانے والے ملک میں بھیج رہا تھا۔یہ تو خدائے بزرگ وبرتر کا شکر ہے کہ اس نے قدم قدم پر ہمارے ایٹمی پروگرام کی غیبی طریقوں سے مدد فرمائی یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی عنایت تھی کہ یہ پتھر ہمیں اس وقت ہی مل گیا کہ جب ابھی کہوٹہ میں عملی سرگرمیاں شروع تھیں۔اسے ہمارے رب کریم کا فضل نہ سمجھیں تو اور کیا کہیں کہ ہمارا ایٹمی پروگرام ابتداء سے لیکر انتہاء تک دشمنوں کی نظروں سے اوجھل رہا۔یہ الگ بات ہے کہ ہر دور میں اس پر طرح طرح کے پروپیگنڈے کیے جاتے رہے جو دلائل اور عقل سے عاری تو ہوتے ہی تھے بلکہ ان میں حواس باختگی کا بھی عنصر نمایاں ہوتا۔

قارئین کرام! یہ پتھر وہاں کیسے پہنچا تو اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ”کہوٹہ دشمن لابی“ کا کام تھا اب کہوٹہ دشمن لابی بھی دو طرح کی ہے ایک تو یہ مغربی، یہودی اور ہندو لابی ہے اور دوسرے پاکستان کے اندر ہی یہود و ہنود اور نصاریٰ کی تنخواہ دار اور نمک حلال لابی (جو محض کہوٹہ پراجیکٹ سے حسد و بغض کا شاخسانہ تھی) ہے ان کی بالترتیب ہم دو قسمیں بناتے ہیں

اوّل: مغربی، یہودی اور ہندو لابی

دوم: کہوٹہ دشمن لابی

ہم پاکستان اور پاکستانی قوم کے عظیم ترین ایٹمی پروگرام کی راہ میں حائل ان سازشوں، ہتھکنڈوں اور خباثتوں سے مکمل طور پر آپ کو آگاہ کریں گے، جوان دونوں پاک دشمن لابیوں نے کئے لیکن جیسا کہ اس کتاب کے پیش لفظ میں' میں یہ ذکر کر چکا ہوں کہ ہمارا زیادہ تر موضوع بحث نمبر دوم یعنی '' کہوٹہ دشمن لابی'' کی سازشیں ہونگی کہ جو اس نے پاکستانی ایٹمی پروگرام اور بالخصوص محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف کیں اور کیونکر انہوں نے محسن پاکستان کے بڑے قد کو چھوٹا کرنے کی ناکام اور ذلیل کوشش کی۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے شروع دن سے ہی جہاں ایک طرف امن کے نام نہاد یورپی ٹھیکدار، اسکی راہ میں روڑے اٹکانا شروع ہوگئے تھے وہیں پاکستان کے اندر بھی ایک مخصوص لابی کھڑی ہوگئی جسکا بنیادی کام تو پاکستان کو ایٹمی پروگرام کے حوالے سے خود کفیل کرنا تھا لیکن وہ اس کے برعکس ہر ایسی کوشش کی مخالف تھی جو کہ پاکستان کو جوہری صلاحیت سے مالامال کرنے کے لئے کی جاتی۔ آیئے ہم زیر نظر سطور میں اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ کس طرح کہوٹہ دشمن لابی نے روز اول ہی سے نہ صرف محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی مخالفت شروع کر دی بلکہ یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان کبھی بھی ایٹمی طاقت نہیں بن سکتا۔

ایٹمی پروگرام کا آغاز

1971ء میں رونما ہونے والا یہ سانحہ مشرقی پاکستان اہل پاکستان کے لئے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ چانکیہ کے چیلوں نے اپنی روایتی مکاری سے مادر وطن کو دولخت کر دیا تو یہ صدمہ کسی بھی پاکستانی کی قوت برداشت سے باہر تھا بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے 16 دسمبر 1971ء کو پاکستان کے دولخت ہو جانے کے بعد بھارت میں جشن فتح مناتے ہوئے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ '' یہ جو ہمیں فتح حاصل ہوئی، یہ ہماری افواج کی فتح نہیں ہے یہ ہماری حکومت کی فتح بھی نہیں ہے۔ یہ ہمارے نظریہ کی فتح ہے ہم نے ان سے (پاکستانیوں سے) کہا تھا کہ ان کا نظریہ باطل اور ہمارا نظریہ برحق ہے۔ لیکن وہ نہ مانے، ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ انکا نظریہ باطل تھا اور آج ہم نے انکا دو قومی نظریہ بحر ہند میں دفن کر دیا ہے'' بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی کا یہ دعویٰ ہر پاکستانی کو کھلا چیلنج تھا۔ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان ان دنوں پاکستان سے ہزاروں میل دور ہالینڈ کے ایک شہر میں واقع ایک یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ سانحہ مشرقی پاکستان میں بھارتی فوجوں کے ہاتھوں پاکستانی فوج کی توہین کے دردناک مناظر ان دنوں ہالینڈ کے سرکاری ٹیلی ویژن سے بار بار دکھائے جا رہے تھے۔ یہ اذیت ناک مناظر ڈاکٹر خان کی قوت برداشت سے باہر تھے۔ انہوں نے شدت غم میں اپنا ٹیلی ویژن بھی توڑ دیا اور اس کے بعد وہ کئی دن تک روتے رہے۔ انہوں نے اسی دن سے وطن عزیز کے لئے کچھ کر گزرنے کا عزم کر لیا تھا۔ ڈاکٹر خان تعلیم کے ساتھ ساتھ ہالینڈ ہی میں واقع ایک فرم کے تحت ہالینڈ کے ایک قصبہ ''المیلو'' میں '' یورینکو انرچمنٹ پلانٹ'' میں کام کرتے تھے۔ ڈاکٹر خان کی ذمہ داری مختلف دستاویزات کا ترجمہ کرنا تھا۔ اس دوران ڈاکٹر خان کے پاس کئی ایسی دستاویزات بھی آتی رہیں جن میں یورینیم کی افزودگی کے متعلق مواد ہوتا تھا ڈاکٹر خان فائلوں کا ترجمہ کرتے اور مقررہ تاریخ تک واپس کر دیتے لیکن انہی دنوں آپ (یورینیم کی افزودگی کیسے کی جاتی ہے اور اسکا ایٹم بم کی تیاری میں کیا کردار ہے یہ ہم اسی کتاب کے باب '' ایٹمی دھماکے'' میں بحث کریں گے)۔ انہی دنوں ڈاکٹر خان نے اس وقت کے پاکستانی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو تفصیلی خط لکھا کہ وہ یورینیم کی افزودگی

کے متعلق مکمل طور پر جانتے ہیں اور پاکستان کو ناقابل تسخیر بنانے کے لئے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں اگر چہ اپنے اس تفصیلی خط میں سٹیل مل میں خدمات سرانجام دینے کا اشارہ دیا تھا لیکن مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے ذہن میں اس خط نے ایک طوفان بپا کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے جہاندیدہ نگاہوں سے بھانپ لیا کہ انکے خوابوں (ہم گھاس کھالیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے) کی تعبیر ڈاکٹر خان کی صورت میں انکے سامنے آگئی ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر خان کی ''المیلو'' میں واقع یورینکو انرچمنٹ پلانٹ کی وابستگی سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور انہوں نے ہالینڈ میں متعین پاکستانی سفیر جے جی خراس (J.G KHRAS) کے ذریعہ سے ڈاکٹر خان کو اطلاع بھجوائی کہ آپ پہلی فرصت ہی میں پاکستان تشریف لا کر ان سے ملاقات کریں۔ جسکے جواب میں انہوں نے مسٹر بھٹو کو ایک خط ارسال کیا کہ ان دنوں چھٹیاں ملنا تھوڑا مشکل ہے البتہ میں ہر سال کرسمس کی تعطیلات پاکستان میں گزارتا ہوں اگر وزیر اعظم مناسب سمجھیں تو اس ملاقات کو اس وقت تک کے لئے مؤخر کر دیں۔ اس دوران وزیر اعظم بھٹو سیکرٹ سروسز اور سفارتی ذرائع سے المیلو پلانٹ کی اہمیت اور محسن پاکستان کے متعلق مفصل معلومات حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر خان کو پیغام بھجوایا کہ وہ جب بھی پاکستان تشریف لائیں تو ان کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر امتیاز سے رابطہ کریں۔

http://kitaabghar.com

دسمبر 1974ء میں جب ڈاکٹر خان اپنی اہلیہ اور دو بیٹوں کے ہمراہ پاکستان میں آئے تو انہوں نے بریگیڈیئر امتیاز کی وساطت سے بھٹو مرحوم کو اپنی پاکستان آمد سے آگاہ کیا۔ وزیر اعظم نے انہیں فوراً اسلام آباد بلوایا۔ دوران گفتگو جب ڈاکٹر خان نے بھٹو مرحوم پر واضح کیا کہ ری پروسیسنگ پلانٹ کی خریداری مکمل طور پر ایک خسارے کا سودا ہے جبکہ سینٹری فیوج پلانٹ کے ذریعہ سے پاکستان بہت جلد ایٹمی طاقت بن جائیگا تو بھٹو سوچ میں پڑ گئے کہ جو پلانٹ برطانیہ، جرمنی اور ہالینڈ کے اشتراک سے بیس سال سے زائد عرصہ میں تقریباً بیس کروڑ ڈالر کے اخراجات سے پچیس ہزار سائنسدانوں اور انجینئرز نے قائم کیا ہے اسے پاکستان جیسا پسماندہ اور ترقی پذیر ملک کیسے قائم کر پائے گا۔ تاہم ڈاکٹر عبدالقدیر خان وزیر اعظم کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ پاکستان میں یہ کارنامہ کوڑیوں کے مول انجام پا سکتا ہے اور سات آٹھ سال کے اندر اندر ہم اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ جس پر مسٹر بھٹو نے انہیں سمجھایا کہ وہ سٹیل مل کے چکر میں پڑنے کی بجائے یورینیم انرچمنٹ پلانٹ کی تنصیب میں پاکستان کی رہنمائی فرمائیں۔

پاکستان اٹامک انرجی کمیشن اور ڈاکٹر خان

ان دنوں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے سربراہ منیر احمد خان تھے جن پر وزیر اعظم بھٹو کو بے پناہ اعتماد تھا لیکن وہ گزشتہ کئی سالوں سے ایٹمی پروگرام کے متعلق بھٹو اور دیگر ذمہ داران کو اندھیرے میں رکھے آ رہے تھے۔ مسٹر بھٹو نے ڈاکٹر خان کو بھی ان سے مشاورت کرنے کی ہدایت دی۔ ڈاکٹر خان نے ایٹمی توانائی کمیشن کی مختلف تنصیبات کا معائنہ کیا اور منیر احمد خان سے چند ملاقاتوں کے دوران ان میں یہ اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کی کہ گو کہ ہمارے ہاں بنیادی ڈھانچہ نہ ہونے کے برابر ہے لیکن چونکہ حکومت پورے خلوص کے ساتھ مطلوبہ سہولتیں فراہم کرنے پر آمادہ ہے اسی لئے اگر ہمت سے کام لیا جائے تو ہم جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے منیر احمد خان اور ایٹمی توانائی کمیشن کے بعض دیگر ذمہ داران کو جوہری قوت کے حصول کے متعلق ضروری معلومات دیں۔ کمیشن کے ذمہ داران نے انہیں یقین دلایا کہ انکے دوبارہ آنے تک بہت زیادہ پیش رفت

ہو چکی ہو گی۔ ڈاکٹر خان مسٹر بھٹو سے دوبارہ ملاقات کر کے واپس ہالینڈ چلے گئے۔

ڈاکٹر خان کو گزشتہ واقعات سے یہ اندازہ تو ہو چکا تھا کہ قدرت ان سے بہت جلد کوئی بڑا کام لینے والی ہے اور شاید اب اس قسم کے پورا ہونے کا وقت آن پہنچا ہے جو انہوں نے سانحہ مشرقی پاکستان کے وقت کھائی تھی (اب میں دوبارہ اپنی زندگی میں مادر وطن پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا) اسی لئے اب انکا زیادہ وقت اپنے موضوع سے متعلق کتب اور دیگر مواد کے مطالعہ میں صرف ہونے لگا۔ دسمبر 1975ء کی تعطیلات میں جب آپ وطن تشریف لائے تو یہاں کچھ ایسے اسباب پیدا ہو چکے تھے جن کا ذکر ابھی ہونے والا ہے اسی لیے اب وہ پاکستان ہی کے ہو کر رہ گئے اور واپس ہالینڈ نہ جا سکے۔ وہ اسباب یہ تھے کہ ڈاکٹر خان کے مشورے کے بعد منیر احمد خان نے حکومت سے جو بھی مراعات طلب کیں وہ انہیں مہیا کر دی گئیں تھیں لیکن اس کے برعکس کام کی رفتار تقریباً صفر تھی۔ ڈاکٹر خان نے اب بھی وطن واپس آتے ہی وزیراعظم سیکرٹریٹ کو اپنی آمد سے مطلع کیا تو وزیراعظم نے انہیں فوراً اسلام آباد طلب کیا۔ جب ڈاکٹر خان اسلام آباد پہنچے تو بھٹو کسی دورے پر لاڑکانہ جا چکے تھے۔ لیکن جانے سے پہلے ہدایات جاری کر گئے تھے کہ منیر احمد خان ڈاکٹر خان کو وہ تمام کام جو انکی ہدایات کے تحت ایک سال میں ہوا اور کام کی رفتار سے بھی آگاہ کریں۔ ڈاکٹر خان ہالینڈ سے مسلسل ہدایات بھجواتے رہتے تھے۔ اور چند ماہ قبل منیر احمد خان نے ڈاکٹر خان کو یہ پیغام بھی بھجوایا تھا کہ اس پراجیکٹ پر اچھی خاصی پیش رفت ہو چکی ہے مگر یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی تھی کام تو جوں کا توں تھا۔ منیر احمد خان کی اس کام میں سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ انہوں نے یہ پروجیکٹ ایک ایم ایس سی الیکٹریکل انجینیئر کے حوالے کر دیا جو یورینیم کی افزودگی کے منصوبے کو سمجھنے سے بھی قاصر تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کام کی نوعیت کو دیکھ کر بے حد مایوس ہوئے اور وہ سمجھ گئے کہ اس کام میں قطعی مخلص نہیں ہیں بلکہ وہ تمام لوگ اس پراجیکٹ کی بنیادی معلومات سے بھی نابلد ہیں اس لئے اب یہ توقع کرنا کہ ان سے کسی معجزے کا ظہور ہو جائے گا یہ ناممکن ہے اس دوران بھٹو لاڑکانہ سے واپس آئے تو انہوں نے ڈاکٹر خان کو طلب کیا اور رپورٹ مانگی تو انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر انہیں تمام صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ اور وزیراعظم کو بتایا کہ وہ جنوری 1976ء کے اوائل میں واپس ہالینڈ جا رہے ہیں بھٹو نے انہیں چند دن انتظار کرنے کو کہا۔

اس عرصہ میں بھٹو اپنے چند معتمد رفقاء سے مشورہ کر چکے تھے۔ پھر ایک دن انہوں نے ڈاکٹر خان کو بلایا اور کہا کہ وہ اب واپس نہ جائیں بلکہ وطن عزیز کی خدمت کے لیے ایٹمی توانائی کمیشن کی رہنمائی فرمائیں۔ ڈاکٹر خان نے بتایا کہ وہ اپنے اہلخانہ سے مشاورت کے بعد اپنے فیصلے سے آگاہ کریں گے۔ اور جب ایک دن ڈاکٹر خان نے وزیراعظم کو بتایا وہ واپس ہالینڈ نہیں جا رہے بلکہ انہوں نے وزیراعظم کی دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ تو بھٹو خوشی سے چہک اٹھے اور اسی لمحے انہوں نے میز پر مکہ مار کر کہا I will see the Hindu Bastards Now انہوں نے ڈاکٹر خان کو ہدایت کی کہ وہ اب ایٹمی انرجی کمیشن کی رہنمائی کریں گے۔ جہاں پر انہیں بطور ایڈوائزر مقرر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر خان ہالینڈ میں واقع المیلو پلانٹ سے جو تنخواہ لیتے تھے وہ اس وقت کی پاکستانی کرنسی کے حساب سے 30 ہزار بنتی تھی لیکن یہاں پر منیر احمد نے انہیں "وطن دوستی" اور "وسیع تر قومی مفاد" کے نام پر صرف 3000 ہزار روپے ماہانہ پر رضامند کر لیا۔ اور اس کے لئے کنٹریکٹ مئی 1976 میں کیا گیا اور یوں انہیں پہلی تنخواہ جون 1976 میں ملی۔ اب اسے آپ منیر احمد خان اور انکے حواریوں کی تنگ نظری کہہ لیں یا تعصب کہ انہوں نے ڈاکٹر خان کو ابتداء میں ہی برداشت نہ کیا

بلکہ ان کی اتنی کردارکشی کی گئی کہ خدا کی پناہ۔ بہرحال اٹامک انرجی کمیشن میں باقاعدہ شمولیت کے چند ہفتوں بعد ہی محسن پاکستان نے بھانپ لیا کہ کمیشن کے ذمہ دار اس اہم معاملے میں سنجیدہ نہیں ہیں اور ہر چیز سست روی سے چل رہی ہے اور ہر کاغذ یونہی منیر احمد سے دستخط کروانے کے لئے بھیجا جاتا ہے تو وہ مایوس ہو گئے اور باتوں باتوں میں ہی لوگوں سے اپنے دردِ دل کا اظہار کرنے لگے۔ جب یہ باتیں بھٹو صاحب تک پہنچیں تو انہوں نے اپنے ذرائع سے تصدیق کروائی تو انہیں معلوم ہوا کہ حالات بہت گڑبڑ میں ہیں اور ڈاکٹر خان واپس ہالینڈ جانے کی سوچ رہے ہیں۔ اس پر وزیراعظم سخت برہم ہوئے۔ ڈاکٹر خان کو طلب کر کے صورتحال سے آگاہی چاہی۔ تو ڈاکٹر خان نے بے دھڑک سب کچھ سنا دیا اور کہا کہ یہ لوگ جھوٹے اور مکار ہیں۔ نہ انہیں وطنِ عزیز سے کوئی محبت ہے اور نہ ہی یہ آپ کے وفادار ہیں۔ یہ آپ کو غلط باتیں بتاتے ہیں کام کچھ بھی نہیں ہو رہا اور نہ ہی اس طرح سے کام ہونا ممکن ہے۔ ڈاکٹر خان منیر احمد خان کے تحت کام کرنے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔

قارئین کرام! اندازہ لگائیں کہ صرف چھ ماہ ہی میں ڈاکٹر خان کو کس حد تک مجبور کیا گیا کہ وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ شروع دن سے ہی ہمارا ایٹمی پروگرام خدائے ذوالجلال کی خاص رحمت کے زیرِ سایہ ہے کہ جس کی ایک بڑی مثال آپ کے سامنے ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ شروع دن سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی ان لوگوں سے جان چھوٹ گئی۔ کہ جب ابھی کوئی کام نہ ہوا تھا لیکن پھر بھی جہاں تک ان سے ہو سکا یہ ہمارے اس عظیم و تاریخی ایٹمی پروگرام کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہے۔ جس کا ذکر آئندہ ابواب میں آئے گا۔

پروجیکٹ 706

پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے ذمہ داران سے مایوسی کے بعد بھٹو نے ڈاکٹر خان کو کہا کہ آپ ابھی واپس جانے کے بجائے کچھ دن انتظار کریں۔ آخر ایک دن ڈاکٹر خان کے کہنے پر وزیراعظم نے انہیں نیوکلیئر پروگرام کے لئے علیحدہ اختیارات دے دیئے اور یوں وزارت دفاع میں 31 جولائی 1976 میں ڈاکٹر خان کی براہ راست نگرانی میں انجینئرنگ ریسرچ لیباٹریز کے نام سے ایک خودمختار ادارہ قائم کر دیا۔ اس ادارے کا خفیہ فائلوں میں نام "پروجیکٹ 706" ہے جسکو یہودی لابی نے بہت اچھالا اور پروجیکٹ 706 کے نام سے ڈاکٹر خان کے خلاف ایک انتہائی بے ہودہ فلم بنائی۔ اس بدنام زمانہ فلم میں ڈاکٹر خان کو شیطان، ڈاکو اور اسمگلر جیسے الزامات دیئے گئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نام نہاد چند سائنسدان جو آج نیوکلیئر پروگرام کے "بانی اور خالق" ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں آج تک یورپی، یہودی یا ہندو لابی کے پروردہ نام نہاد ادارے "عالمی ایٹمی توانائی ایجنسی" IAEA کے چہیتے کیوں رہے ہیں؟ اس کا جواب وہ تو کبھی نہیں دیں گے لیکن آیئے میں آپکو ان سوالوں کے جوابات دیتا ہوں۔

قارئین! شاید آپ کو آئندہ باتیں پڑھ کر شرم محسوس ہو۔ لیکن میں ان تمام حقائق کو آپکے گوش گزار کرنا اپنا فرض بھی سمجھتا ہوں اور یوں بھی یہ ہم پر واجب ہے کہ ہم اپنے ان عظیم محسنوں کہ جنہوں نے آج وطن عزیز کے دفاع کو ناقابل تسخیر بنا دیا۔ آج ہم ان پر انگلی اٹھانے والوں کی حقیقت واضح کریں۔

ڈاکٹر خان نے ایٹمی توانائی کمیشن کیوں چھوڑا اور آخر کیوں وہ ان سے اتنے مایوس ہو گئے۔ اس کے لئے میں ایک دو مثالیں آپکو

دیتا ہوں۔ امریکیوں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ پاکستان میں ہونے والے اعلیٰ سطحی اجلاسوں کی کاروائی سے بھی مکمل پر آگاہ ہوجاتے ہیں بلکہ اب تک ہونے والے ہر طرح کے خفیہ اجلاسوں کی کاروائی میں بھی کوئی نہ کوئی امریکہ نواز موجود ہوتا ہے۔ کہوٹہ کے معاملات کی نگرانی کے لئے بھی ایک اعلیٰ سطحی بورڈ قائم تھا۔ ایک مرتبہ صدر ضیاء الحق نے جنرل اختر عبدالرحمٰن اور جنرل ضامن نقوی سے کہوٹہ کے بعض اہم اور نازک معاملات پر بات چیت کے دوران کہا کہ ''وہ منیر احمد خان سی آئی اے کا ایجنٹ ہے'' ڈاکٹر قدیر سے کہہ دو کہ ''وہ اس کی موجودگی میں کوئی خاص بات نہ کیا کریں'' یہ ہے ایک واقعہ کہ جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا وجوہات ہونگی کہ جن کی بنا پر ڈاکٹر خان ان لوگوں سے اتنے بدظن ہوگئے۔

میں اس طرح کا صرف ایک اور واقع آپکی خدمت میں عرض کروں۔ محترم زاہد ملک فرماتے ہیں کہ اس وقت کے سیکٹری خارجہ نیاز اے نائیک نے مجھے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا ذاتی دوست سمجھتے ہوئے ایک واقعہ سنایا کہ مجھے یہ واقعہ صاحبزادہ یعقوب خان نے ان الفاظ میں سنایا ہے ''اپنے امریکی دورے کے دوران اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں' میں بعض اعلیٰ امریکی افسران سے باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کررہا تھا کہ دوران گفتگو امریکیوں نے حسبِ معمول پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا ذکر شروع کردیا اور دھمکی دی کہ اگر پاکستان نے اس حوالے سے اپنی پیش رفت بند نہ کی تو امریکی انتظامیہ کیلئے پاکستان کی امداد جاری رکھنا مشکل ہوجائے گا۔ ایک سنیئر یہودی آفیسر نے کہا'' نہ صرف یہ بلکہ پاکستان کو اس کے سنگین نتائج بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہیے'' جب ان کی گرم سرد باتیں اور دھمکیاں سننے کے بعد میں نے کہا کہ آپ کا یہ تاثر غلط ہے کہ پاکستان ایٹمی توانائی کے حصول کے علاوہ کسی اور قسم کے ایٹمی پروگروام میں دلچسپی رکھتا ہے تو سی آئی اے کے ایک افسر نے جو اسی اجلاس میں موجود تھا کہا کہ آپ ہمارے دعویٰ کو نہیں جھٹلا سکتے۔ ہمارے پاس آپ کے ایٹمی پروگرام کی تمام تر تفصیلات موجود ہیں بلکہ آپکے اسلامی بم کا ماڈل بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ کہہ کر سی آئی اے کے افسر نے قدرے غصے بلکہ ناقابل برداشت بدتمیزی کے انداز میں کہا کہ آیئے میرے ساتھ بازو والے کمرے میں۔ میں آپ کو بتاؤں آپ کا اسلامی بم کیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ دوسرے امریکی افسر بھی اٹھ بیٹھے۔ میں بھی اٹھ بیٹھا۔ ہم سب اسکے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ سی آئی اے کا یہ افسر ہمیں دوسرے کمرے میں کیوں لے جارہا ہے۔ اور وہاں جا کر یہ کیا کرنے والا ہے۔ اتنے میں ہم سب ایک ملحقہ کمرے میں داخل ہوگئے۔ سی آئی اے کا یہ افسر تیزی سے قدم اٹھا رہا تھا ہم اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے کمرے کے آخر میں جا کر اس نے بڑے غصے کے عالم میں اپنے ہاتھ سے ایک پردہ کو سرکایا تو سامنے میز پر کہوٹہ ایٹمی پلانٹ کا ماڈل رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف ایک سٹینڈ پر فٹ بال نما کوئی گول سی چیز رکھی ہوئی تھی۔ سی آئی اے کے افسر نے کہا'' یہ ہے آپکا اسلامی بم۔ اب بولو تم کیا کہتے ہو کیا تم اب بھی اسلامی بم کی موجودگی سے انکار کرتے ہو؟ میں نے کہا میں فنی اور تکنیکی امور سے نابلد ہوں میں یہ بتانے یا پہچان کرنے سے قاصر ہوں کہ یہ فٹ بال قسم کا گولہ کیا چیز ہے۔ اور یہ کس چیز کا ماڈل ہے لیکن اگر آپ لوگ بضد ہیں کہ یہ اسلامی بم ہے تو ہوگا میں کچھ نہیں کہہ سکتا سی آئی اے کے افسر نے کہا کہ آپ لوگ تردید نہیں کرسکتے ہمارے پاس ناقابل تردید ثبوت موجود ہیں۔ آج یہ میٹنگ ختم کی جاتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر کی طرف نکل گیا۔ اور ہم بھی اسکے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئے۔ میرا سر چکرا رہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے جب ہم کاریڈور سے ہوتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے تو میں نے غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر عبدالسلام ایک دوسرے کمرے سے نکل کر اس کمرے میں داخل ہورہے ہیں۔ جس میں بقول سی آئی اے کے

اس کے اسلامی بم کا ماڈل پڑا ہوا تھا میں نے اپنے دل میں کہا اچھا تو یہ بات ہے"

ایک امریکی صحافی نے مجھے بتلایا کہ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے دورہ امریکہ کے دوران صدر بش اور سی آئی اے کے ڈائریکٹر وبیسٹر نے انہیں بھی ایک کمرہ میں لیجا کر وہی ''اسلامی بم'' دکھایا تھا۔

آپ خود اندازہ لگائیں کہ اسطرح کے حالت میں ڈاکٹر خان نے آخر کیونکر ایک علیحدہ ادارے کا وجود ضروری سمجھا؟ یہ فیصلہ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بعد میں یہی ''پروجیکٹ 706'' انجینئرنگ ریسرچ لیباٹریز سے کہوٹہ ریسرچ لیباٹریز کے نام سے مشہور ہوا۔ جسے بالآخر محسن پاکستان کی خدمات کے صلے میں یکم مئی 1981 میں صدر جنرل ضیاء الحق نے ''خان ریسرچ لیباٹریز'' KRL کے نام سے موسوم کردیا۔ اس ادارے کی تاریخ آئندہ باب ''کہوٹہ مکمل پاکستانی کوشش'' میں بیان کی جائے گی۔

کہوٹہ دشمن لابی کے الزامات

قارئین کرام! یہاں میں کہوٹہ دشمن لابی کے ان چند الزامات کا ذکر کروں گا جو انہوں نے محسن پاکستان، نیوکلیئر پروگرام اور خود وطن عزیز پر عائد کئے ہیں۔ میری یہ کتاب دراصل کہوٹہ دشمن لابی کے ان الزامات کی ہی جواب ہے۔ میں ذیل میں صرف ان لوگوں کی طرف سے عائد کئے گئے الزامات کا ہی ذکر کروں گا لیکن ان الزامات کے جوابات آپ اس کتاب کے مختلف حصوں میں پائیں گے۔ آپ کہوٹہ دشمن لابی کے ان الزامات سے ہی اندازہ کریں گے کہ اس گروہ نے جہاں محسن پاکستان کی شخصیت پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے وہیں انہوں نے افواج پاکستان اور مملکت خداد پاکستان کو بھی معاف نہیں کیا۔ منیر احمد خان اور انکے ساتھیوں نے ڈاکٹر خان پر جو الزامات لگائے وہ اس طرح ہیں۔

1۔ ڈاکٹر خان اپنی شہرت کے جنون میں مبتلا اور خود پرست شخص ہیں۔ انتہائی گھمنڈی اور خرچیلے ہیں۔ انہوں نے 1988 سے اب تک اپنی شہرت اور شخصیت کو بالا کرنے کے لئے ملکی اور غیر ملکی میڈیا کے لوگوں پر پچاس ملین روپے خرچ کئے۔

2۔ ڈاکٹر خان نے اپنی بیٹیوں کی شادی پر آرائشی سامان (ٹیلیفون، ٹینٹ وغیرہ) فلوریڈا سے منگوایا۔ چالیس لاکھ ڈالر خرچ ہوئے۔ دونوں بیٹیوں کو BMW گاڑیاں اور مکانات تحفے میں دیئے۔

3۔ ڈاکٹر خان نے اپنے ڈرائیور اور پامسٹ سمیت بہت سے لوگوں کو مکانات بنوا کر دیئے۔

4۔ ڈاکٹر خان کا قبضہ مافیا سے تعلق ہے اسلام آباد میں ان کی 22 جائیدادیں ہیں۔ بیرون ملک بھی بھاری پراپرٹی بنائی ہوئی ہے۔

5۔ ڈاکٹر خان رشوت خور ہیں۔ آئی ایس آئی کے ایک ریٹائرڈ افسر کے مطابق 80 کے عشرے میں جب جنرل حمید گل آئی ایس آئی کے سربراہ تھے۔ پہلی دفعہ نشاندہی ہوئی۔ جنرل گل نے باقاعدہ ایک رپورٹ وزیر اعظم کو دی مگر کوئی ایکشن نہ ہوا، پھر جنرل محمود احمد سے جھڑپ ہوئی اور ان کی تجویز پر ہی انہیں کہوٹہ سے فارغ کیا گیا۔

6۔ کہوٹہ پروجیکٹ پر دس بلین ڈالر خرچ ہوئے ان کا کوئی حساب نہ رکھا گیا۔ زیادہ تر خریداریاں دبئی میں قائم اپنے بھائی عبدالقیوم خان اور داماد نعمان شاہ کی فرم کے ذریعے ہوئیں اس فرم کو پرکشش ٹھیکے دیئے گئے اور یوں بالواسطہ طور پر بھاری رقوم وصول کیں۔

7۔ ڈاکٹر خان نے ٹمبکٹو میں کروڑوں روپے کے خرچ سے بیوی کے نام پر ہوٹل بنایا اس کے لئے فرنیچر اور دیگر سامان C-130 سے بھیجا گیا سنیئر سائنسدان ڈاکٹر فاروق ساتھ گئے وہاں چونکہ C-130 طیارہ اترنے کی سہولت نہ تھی اس لئے طیارہ ٹریپولی میں اتارا گیا۔ اس کا کچھ سامان امریکہ کے ہاتھ لگ گیا۔

8۔ انڈرورلڈ مافیا سے تعلق ہے دبئی میں سونے کے پاکستانی تاجر سے قریبی تعلق ہے روزانہ ٹیلی فون پر بات ہوتی ہے۔

9۔ لیبیا اور ایران کو ایٹمی ٹیکنالوجی بیچی، شام وعراق کو پیش کش کی، ایران کو معلومات اور بلیو پرنٹس دینے کے علاوہ سنٹری فیوج بنانے میں مدد دی، جنرل بیگ اور آئی ایس آئی کے ایک سابق ڈی جی جنرل اسد درانی کو علم ہے کیونکہ دونوں ایران کی مدد کے حامی تھے۔

10۔ ڈاکٹر خان کے بیرون ملک کئی بنک اکاؤنٹس میں کروڑوں روپے جمع ہیں۔ ایران سے ملنے والا پیسہ دبئی کے بنک میں رکھا گیا۔ ایرانی حکومت نے اس کی تصدیق کردی آئی اے ای اے اور امریکہ کو تفصیلات مل گئی ہیں۔

11۔ انیس سے زائد مرتبہ شمالی کوریا کے خفیہ دورے کئے وغیرہ وغیرہ۔

مزید تفصیلات میں جائے بغیر مختصر طور پر کہنا مناسب ہوگا کہ ایک ایسی ہستی کے خلاف اس قدر بے بنیاد مضحکہ خیز ناقابل یقین اور دل آزار الزامات کی بوچھاڑ کردی گئی جو کہ ایک فرشتہ صفت شخصیت ہیں جس کے محیّر العقول کارنامے کی بنا پر آج پاکستانی سینہ تان کر چلتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر خان پر اس قسم کے الزامات پہلی دفعہ نہیں لگے، بلکہ 2001 میں جب انہیں خان لیباٹریز سے فارغ کیا گیا تھا اور اس پر عوام نے شدید ردعمل کا اظہار کیا کیونکہ وہ انہیں تاحیات خان لیباٹریز کا چیئرمین رکھنے کے حق میں تھے تو اس وقت بھی عوامی ردعمل کی شدت کم کرنے اور ڈاکٹر خان کے قد کو گھٹانے کیلئے "باخبر ذرائع" نے اسی قسم کی بعض خبریں شائع کروائی تھیں۔ اس وقت بھی کہا گیا تھا کہ کے آر ایل کے حسابات کا کبھی آڈٹ نہیں ہوا تھا، پہلی بار کے آر ایل کا آڈٹ ہوا تو یہ بات سامنے آئی کہ سات ارب روپے کا کوئی حساب موجود نہیں ہے کہ یہ رقم کہاں خرچ ہوئی؟ اس وقت کسی نے یہ خبر بھی شائع کروادی تھی کہ ڈاکٹر خان اسلام آباد میں ساشے کے نام سے جو فلاحی تنظیم چلا رہے ہیں انہوں نے اسکی خاتون سربراہ کے ساتھ خفیہ شادی رچالی ہے اس وقت جو دوسرے الزامات تراشے گئے وہ کچھ یوں تھے۔

☆ یہ وہ ڈاکٹر خان نہیں جنہوں نے کہوٹہ پروجیکٹ کا آغاز کیا تھا، وہ کوئی اور ڈاکٹر خان تھے۔ اور یہ ڈمی کے طور پر آگے لائے گئے تھے تاکہ پاکستان کے دشمنوں کو مغالطہ میں رکھا جائے۔

☆ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایک بدمزاج اکھڑ اور خود پسند آدمی ہے۔

☆ صوابدیدی فنڈز کو ذاتی اخراجات کے لئے بھی استعمال کرتے تھے۔

☆ سی ڈی اے میں ایک قبضہ گروپ کو ان کی آشیرباد حاصل رہی اور انہوں نے کئی پلاٹوں پر قبضہ کیا۔

☆ ایٹم بم بنانے میں ان کا کوئی کردار نہیں ہے۔

☆ انہوں نے مالی بے ضابطگیاں کیں جو ثابت بھی ہوگئیں لہذا انہیں باعزت گھر بھیجنے کے لئے مشیر بنایا گیا ہے۔

محسن پاکستان کا معجزہ

آپ اندازہ لگایئے کہ ان لوگوں کا کام قوم کو کوئی خوشخبری سنانا تھا لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انہوں نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور انکے ساتھیوں کی ہتک آمیزی کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ اور یہ لوگ پاکستان کے حق میں کبھی بھی مخلص نہ تھے۔ جسے ڈاکٹر خان شروع دن سے ہی بھانپ گئے بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ انسان ساری زندگی کسی کے ساتھ گزار دیتا ہے لیکن اسکے دل کا بھید نہیں پاتا۔

لیکن آفرین ہے قوم کے اس مرد فطین پر جنہوں نے صرف چند ماہ میں ہی قوم کے پیسے کا ضیاع کرنے والوں کا بھید پالیا اور نیوکلیئر پروگرام کو ان کی دسترس سے بچالیا۔ یہ ڈاکٹر خان کا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟ پوری قوم کو محسن پاکستان کی شخصیت پر بجا طور پر فخر ہے اور وہ تا قیامت حضرت قائداعظم، حضرت اقبال کے بعد قوم کے ہیرو اور محسن ہیں۔

کیا آپ کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/مصنف/موئف ہیں اور اپنی کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں تو ملک کے معروف پبلشرز "علم و عرفان پبلشرز" کی خدمات حاصل کیجئے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفین اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب ٹائٹل اور اغلاط سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک...... کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میٹر (مواد) دیجئے اور کتاب لیجئے......

خواتین کے لیے سنہری موقع......سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق......

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسا پبلشنگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/مصنفین کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں......

عمیرہ احمد	ماہا ملک	فرحت اشتیاق	رخسانہ نگار عدنان	قیصرہ حیات	انجم انصار
نازیہ کنول نازی	نگہت عبداللہ	رفعت سراج	نبیلہ عزیز	نگہت سیما	میمونہ خورشید علی
اقراء صغیر احمد	ہاشم ندیم	طارق اسماعیل ساگر	ایم۔اے۔راحت	اعتبار ساجد	شیما مجید (تحقیق)
محی الدین نواب	علیم الحق حقی	امجد جاوید	جاوید چوہدری	ایس۔ایم۔ظفر	

مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ علم و عرفان پبلشرز، اُردو بازار لاہور ilmoirfanpublishers@yahoo.com

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

باب دوم

کہوٹہ مکمل پاکستان کوشش

1۔ 'کہوٹہ کی کہانی' ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی زبانی

2۔ بھٹو، ضیاء الحق اور کہوٹہ

3۔ تاریخ کہوٹہ 1

4۔ تاریخ کہوٹہ 2

5۔ کہوٹہ کے دنوں ڈاکٹر خان کے معمولات

کہوٹہ مکمل پاکستانی کوشش

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

کہوٹہ کی کہانی بھی بڑی دلربا ہے۔ کہوٹہ کی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آج بھی خدائے بزرگ برتر کا خصوصی فضل وکرم پاکستان کے سر پر ہے۔ اور یہ قوم کسی بھی وقت کوئی معجزہ دکھا سکتی ہے۔ اس داستان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی طرح وہ افراد جو ہمارے معاشرے کے لیے بے کار تھے انہوں نے ایک ایسی تاریخ رقم کردی کہ پاکستان پوری دنیائے اسلام کا پہلا اور واحد ایٹمی ملک بن گیا۔

قارئین کرام آپ اس باب میں اندازہ لگائیں گے کہ کیسے پاکستان ایٹمی قوت بن گیا۔ اور یہ جو کہوٹہ کے بارے میں الزامات لگائے جاتے ہیں کہ اس کے اکاؤنٹ کا آڈٹ نہیں ہوتا تھا اور اس پروگرام میں قوم کا پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا اس کے بارے میں، میں یہ واضح کرنا چاہوں گا۔ KRL کا سالانہ بجٹ کبھی بھی بیس سے پچیس ملین سے زیادہ نہیں تھا اور میں پوری ذمہ داری کے ساتھ قوم کو یہ بتانا چاہوں گا کہ کہوٹہ کا باقاعدہ آڈٹ ہوتا تھا جو فوج کی ایک خصوصی کمیٹی کرتی تھی اپنے قارئین پر یہ بات بھی ذمہ داری کے ساتھ عیاں کرنا چاہوں گا۔ کہ ڈاکٹر خان پورے پچیس برس تک کہوٹہ سے وابستہ رہے اور ان پچیس برسوں میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایک بھی چیک سائن نہیں کیا تھا بلکہ اس حوالے سے صدر پاکستان اور افواج پاکستان کی ایک خصوصی کمیٹی قائم تھی سارا پیسہ انہیں کے اختیارات میں تھا ڈاکٹر خان سے اس معاملے میں صرف ہدایات اور اجازت لی جاتی تھی۔ تاہم جب ڈاکٹر خان بیرون ممالک میں کہوٹہ پلانٹ میں نصب کی جانے والی مشینری کی خریداری میں مصروف تھے تو اس وقت متعلقہ کمیٹی نے ان کے اکاؤنٹ میں پیسہ بھجوایا تھا۔ تاکہ پرزہ جات کی خریداری میں کوئی مشکل درپیش نہ ہو۔ اور یہ بھی کہ ڈاکٹر خان اس معاملے میں خود مختار ہوں۔ یہاں میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر خان بذات خود بیرون ممالک میں سینٹری فیوج مشینری کی خریداری کرتے رہے ہیں جس کی وجہ سے مغرب یہ نام نہاد پراپیگنڈا کرتا ہے کہ ان کے انڈر ورلڈ کے ساتھ تعلقات ہیں۔ دراصل جن فرعونوں کی وساطت سے ڈاکٹر خان نے مطلوبہ مال خریدا تھا اور جن کے ذریعے وہ مال پاکستان پہنچا تھا وہ مغربی کمپنیاں تھیں اور ڈاکٹر خان کے جس انڈر ورلڈ سے تعلقات کا چرچہ ہے وہ بھی کمپنیاں تھیں بہر کیف ہم زیر نظر باب میں کہوٹہ کے حوالے سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جب یورپ سے مال ملنا بند ہو گیا تو اکثر چیزیں پھر پاکستان میں ہی بنائی گئی تھیں۔ KRL کے دنوں میں بھی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا یہ اُصول تھا کہ وہ اپنی تمام سرگرمیوں سے قوم کو مطلع رکھتے تھے۔ جس کے لیے وہ فوج یا حکومت کے متعلقہ ذمہ داران کو تمام معلومات بہم پہنچاتے رہتے تھے۔ پوری قوم بھی ان سے متفق تھی۔ ڈاکٹر خان نے KRL کے دنوں میں ایک مضمون تحریر کیا تھا کہ ''کہوٹہ کی کہانی میری زبانی'' جس میں کہوٹہ کے حوالے سے اس وقت تک کی تمام کوششوں کا احاطہ کیا گیا تھا۔ ذیل میں ڈاکٹر خان کا وہ مضمون من وعن پیش کیا جا رہا ہے

کہوٹہ کی کہانی، ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی زبانی

میرا تعلق ہندوستان کی چھوٹی ریاست بھوپال سے ہے۔ یہ ایک مسلمان ریاست تھی جہاں اسلام بالکل سادہ طریقے سے اپنایا گیا تھا۔ ہمارے ہاں کسی قسم کی فرقہ پرستی، شرپسندی یا اختلافات وغیرہ کچھ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ بچپن ہی سے ہم سب لوگ نمازی تھے، روزے بھی رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے میں اس وقت سات آٹھ برس کا ہوں گا جب ہم مسجد جاتے تھے تو ہمارے مولوی صاحب ہمیں اذان دینا سکھاتے۔ بعد میں بڑا ہو کر میں اکثر و بیشتر صبح کی اذان دیا کرتا تھا۔

ہمارے گھر میں تعلیم کا رواج شروع ہی سے تھا۔ میرے بڑے ابا یعنی والد کے بڑے بھائی ریاست بھوپال کے محکمہ مالیات کے سیکرٹری تھے۔ ہمارے والد ہیڈ ماسٹر تھے جو سنٹرل پروانس میں مختلف جگہوں پر متعین رہے اور میرے چچا مجسٹریٹ اور دیوان تھے۔ اس طرح بچپن ہی سے میرے دل میں دو پیشوں کا بہت ہی رعب اور اثر رہا۔ ایک استاد اور دوسرے جج۔ یہ اس طرح کہ جب میں اپنے والد یا چچا کے ساتھ بازار جایا کرتا تھا تو میں دیکھتا کہ لوگ بازاروں میں کھڑے جھک جھک کے انہیں سلام کرتے، اپنے پاس بڑے پیار سے بٹھاتے اور دیدہ و دل فرش راہ کیے رکھتے تھے۔ بس یہ چیز ہمیشہ کے لیے میرے دل پر چھا گئی۔

بڑا ہو کر حصول تعلیم کے لیے باہر گیا، وکالت تو نہ کر سکا کہ جج بنتا، لیکن یہ ضرور سوچا کہ سائنسی تعلیم حاصل کر کے کم از کم استاد ضرور بن سکوں، ایم ایس سی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہلے یہ خیال آیا کہ پاکستان واپس چلنا چاہیے پھر سوچا کہ واپس گیا تو تعلیمی پیشے میں کوئی اچھی جاب نہیں ملے گی بہتر ہے پی ایچ ڈی کر لی جائے۔ پھر مجھے فیلوشپ مل گئی اور میں نے پی ایچ ڈی کر لی۔ اس دوران میری تمام تر توجہ اسی پر مرکوز رہی کہ یقیناً کہیں پروفیسری کروں گا اور اس کے لیے ادھر اُدھر دیکھنا بھی شروع کیا۔ آسٹریلیا میں ایک بہت اچھی جگہ نکلی۔ میں نے خط لکھا مگر اس کے جواب میں تاخیر ہو گئی۔ اسی اثناء میں ہالینڈ سے مجھے پیش کش آئی کہ وہاں ایک بڑی انڈسٹری میں ایک اچھے میٹلرجسٹ کی ضرورت ہے میرے پروفیسر نے مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیا۔

ابھی میں بیلجیم سے ہالینڈ پہنچا تھا کہ آسٹریلیا سے جواب آ گیا۔ مگر پروفیسر کے مشورے اور ہالینڈ لانے والوں کی محنت و محبت کے خیال نے آسٹریلیا جانے سے روک دیا اور یوں قدرت نے اسی وقت میری زندگی کا رخ متعین کر دیا۔ اگر میں آسٹریلیا چلا جاتا تو آج غالباً آپ کے سامنے یوں بیٹھا نہ ہوتا۔ ہالینڈ پہنچ کر میں نے ایک بڑے ادارے میں کام شروع کر دیا۔ یہ نیوکلیئر فیلڈ کا انرچمٹ سے متعلق کام تھا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بھوپال میں تین خواتین نے حکمرانی کی، میں اس کی تصحیح کرنے کی جسارت کروں گا کہ تین نہیں چار خواتین، ایک نواب قدسیہ، اس کے بعد سکندر جہاں بیگم، پھر نواب شاہ جہاں بیگم، اس کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم اور پھر کہیں جا کر بیگم نواب حمید اللہ خان۔

بہر حال جب ہالینڈ پہنچا تو یورینیم کی افزودگی کا کام جاری تھا مجھے بھی اسی پر لگایا گیا۔ یہاں بے شمار مشکلات کا سامنا تھا مگر میں نے بڑی محنت سے کام کیا۔ جب میں بیلجیم میں تھا تو اس وقت 1971ء کے مشرقی پاکستان کے واقعات وہاں ہر روز ٹیلی ویژن پر دکھائے جاتے تھے۔ اگرچہ ہم پاکستانیوں کا وہاں یہ اندازہ تھا کہ اس میں کچھ زیادتی ہماری جانب سے بھی ہوئی ہے لیکن جس طریقے سے مغربی ذرائع ابلاغ اس کو پیش کر رہے

تھے، وہ بہت شرانگیز تھا۔ خاص طور پر آل انڈیا ریڈیو، بی بی سی، وائس آف امریکہ، ٹائم اور نیوز ویک وغیرہ ہمیں بالکل بھیڑیے اور شیطان ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب ڈھاکہ کے سرنڈر کی تصویر اور فلم دکھائی گئی، تو جتنے بھی پاکستانی وہاں موجود تھے، ان کا حال ناقابل بیان ہے۔ میری اور میرے ساتھیوں کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔ ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ پاکستان کے سیاسی حالات کچھ ایسا رخ اختیار کرلیں گے کہ پاکستانی افواج اس طرح ذلیل وخوار ہوں گی اور انہیں ہتھیار ڈالنا پڑیں گے۔ اس کے چند ہی مہینے بعد میں ہالینڈ چلا گیا۔

1971ء کا واقعہ دل پر بری طرح اثر تھا کہ 18 مئی 1974ء کو بھارت نے ایٹمی دھماکہ کر ڈالا۔ اب ہمارا وجود بالکل ہی خطرے میں پڑ گیا تھا۔ پہلے آدھا ملک چھین لیا گیا تھا اور اب بھارت نے ایٹمی قوت حاصل کرلی تھی۔ وہ کسی بھی وقت ہم پر حملہ کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب میں ۷۴ء کے اواخر میں پاکستان آیا تو ہر شخص کی زبان پر یہ تھا کہ اب بھارت کی بالادستی قبول کرلی جائے اس سے کسی قسم کا جھگڑا نہ کیا جائے اور اپنی افواج کم کر کے اس کے اخراجات قوم کی ترقی پر خرچ کیے جائیں۔ میں نے اس وقت یہ سوچا کہ اگر اب کوئی احتیاطی قدم نہ اٹھایا تو ہمارا وجود سخت خطرے میں پڑ جائے گا۔ مجھے اس معاملے میں چونکہ پہلے ہی خاصا تجربہ تھا، ہالینڈ سے میں نے حکومت پاکستان کو لکھا کہ آپ اس وقت کے سیاسی حالات سے بخوبی آگاہ ہیں اور آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ بھارت کے ایٹمی دھماکہ کے بعد ہمارا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے اور ہمارے حوصلے پست ہو گئے ہیں اور لوگوں میں کھلے عام اس قسم کی باتیں ہونے لگی ہیں کہ اب بھارت کی بالادستی قبول کرلیں تو پھر پاکستان بنانے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اگر ہمیں بھارت اور ہندوؤں ہی کی بالادستی قبول کرنا تھی تو پھر پاکستان کے لیے یہ تمام جدوجہد، لاکھوں ماؤں، بہنوں اور بھائیوں کا قتل عام کیوں کرایا گیا؟ بہتر یہ ہے کہ ہم اس وقت ہی کوئی لائحہ عمل تیار کر کے اس پر فوراً کام شروع کردیں کہ ہماری سلامتی اور بہبود کا تقاضا یہی ہے۔ مجھے فوراً دعوت دی گئی کہ پاکستان پہنچوں۔

دسمبر 1974ء میں پاکستان آیا اور یہاں میں نے یورینیم کی افزودگی کا طریقہ کار بتا کر واضح کیا کہ اگر ہم اس طریقے سے کام شروع کردیں تو مجھے اُمید ہے کہ بہت ہی کم عرصے میں انشاء اللہ ہم اس میں مہارت حاصل کرلیں گے کہ اگر ملک پر کبھی برا وقت آ پڑے تو اس صلاحیت کو دفاع کے طور پر بروئے کار لاسکیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں اٹامک انرجی کمیشن کے اعلیٰ افسروں سے ملاقات کروں اور انہیں اس بارے میں بتاؤں اور ہدایات دوں۔ میں ان لوگوں سے ملا اور انہیں بتایا کہ یہ کام کس طرح کیا جانا چاہیے اور ہمیں اس کے لیے کس قسم کی مہارت پیدا کرنی ہوگی۔ دو ہفتے اسلام آباد قیام کرنے کے بعد میں کراچی لوٹ گیا جہاں میری ضعیف والدہ اور بہن بھائی مقیم تھے۔ وہاں سے میں واپس ہالینڈ چلا گیا۔

میں دسمبر 75ء میں کرسمس کی چھٹیوں میں پھر پاکستان آیا تو مجھے دعوت دی گئی کہ اسلام آباد آ کر پراجیکٹ کی ترقی اور پراگرس دیکھوں۔ جب میں اسلام آباد پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ پورا ایک سال ضائع کر دیا گیا تھا۔ کسی قسم کا کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ ایک ایسے صاحب کو پراجیکٹ کا انچارج بنا دیا گیا تھا جو الیکٹریکل انجینیرنگ میں ایم ایس سی تھے۔ ان کے ساتھ پانچ چھ ٹیکنیشن تھے اور ساتھ ہی چار پانچ لیتھ مشینیں لگی ہوئی تھیں اور یوں اس طریقے سے ہم نیوکلیئر مہارت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس سے بہتر اور اچھے کارخانے تو میں نے گوجرانوالہ میں دیکھے۔ بہرحال میں نے جنوری ۷۶ء کے شروع میں وزیراعظم صاحب کو بتا دیا کہ تمام وقت ضائع کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے پوچھا اب آپ کا کیا

پروگرام ہے تو میں نے بتایا کہ میں ۹ جنوری کو واپس ہالینڈ چلا جاؤں گا۔ مجھ سے کہا گیا کہ واپس نہ جائیں بلکہ اپنا استعفیٰ بھیج دیں۔ اسے حکم کہہ لیجئے یا درخواست، جو کچھ بھی تھا، اس پر مجھے فوری عمل کرنا تھا۔

میں نے اس سلسلے میں اپنی بیگم سے مشورہ کیا کیونکہ بھوپال میں چار خواتین حکمرانوں کے زیر سایہ رہ کر بیگم کا خیال معلوم کرنا عادت کا حصہ بن گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ کو یقین ہے کہ آپ پاکستان کی خدمت کر سکتے ہیں تو سر آنکھوں پر، مجھے یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں۔

میں نے ہالینڈ استعفیٰ بھیج دیا اور خود یہیں رک گیا۔ ہم نے چند ساتھی اکھٹے کئے اور کام کرنے کی کوشش کی۔ پرانے طریقہ کار کے مطابق کام کرنا قطعی ناممکن تھا۔ جو صاحب پراجیکٹ انچارج تھے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ پراجیکٹ ہے کیا اور اسے کیسے ہینڈل کرنا ہے۔ میں نے وزیر اعظم صاحب کو خط لکھا کہ جناب میں یہاں کام کرنے آیا تھا، نااہلوں کی طرح رہنے کے لیے نہیں، آپ کو مجھ سے کام کرانا ہے تو کرایئے ورنہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں یہاں سے واپس چلا جاؤں تاکہ میرا وقت اور آپ کا پیسہ ضائع نہ ہو۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو دن کے اندر ہمارا پراجیکٹ (ایٹمی توانائی کمیشن سے) علیحدہ کر دیا گیا۔ میرا مشورہ لیا گیا تو میں نے عرض کیا کہ یہ نہایت ہی اہم پراجیکٹ ہے اور اسے پرانے قوانین کے تحت نہیں چلایا جا سکتا ہے اس کے لیے نئے قوانین وضع کرنے ہوں گے اور ہمیں حکومت کے مکمل تعاون کی ضرورت ہوگی۔

ہمارے اس ملک میں جہاں چھوٹی سی سڑک بنانے یا ٹیوب ویل نصب کرنے کی درخواست پر تین تین، چار چار سال لگ جاتے ہیں، دو روز کے اندر اس کا فیصلہ یقیناً معجزے سے کم نہیں۔ اس سلسلے میں سابق صدر محترم غلام اسحٰق خان صاحب کا کردار شروع ہی سے بہت نمایاں رہا ہے۔ وہ اس پراجیکٹ کے انچارج بنا دیئے گئے اور ساتھ ہی پراجیکٹ کی نگرانی کے لیے ایک بورڈ قائم کر دیا گیا۔ اب ہم نے صحیح طور پر کام کرنا شروع کیا۔ پہلا سوال یہ تھا کہ یہ پلانٹ کہاں لگایا جائے۔ اس کے لیے ہم نے پورے پاکستان میں بہت سی جگہوں کا جائزہ لیا اور ان تمام نکات پر غور کیا جو ہمارے نزدیک بے حد اہمیت کے حامل تھے۔ کہوٹہ کا چناؤ بہت ہی غور و خوض کے بعد کیا گیا اگرچہ اس کے بارے میں آج بھی شکایات ہیں کہ یہ انڈین بارڈر کے بہت ہی قریب ہے، بہتر یہ تھا کہ اسے سرگودھا یا میانوالی کے قریب بنایا جاتا، مگر مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں آپ مجھے دس مرتبہ اس پراجیکٹ کے لیے جس جگہ کا چناؤ کرنے کو کہیں تو میں کہوٹہ ہی کا چناؤ کروں گا۔ اس کے بہت سے فوائد تھے، سب سے بڑا فائدہ یہ تھا ہم دارالحکومت کے بالکل قریب تھے۔ ہمارا مرکزی حکومت کے قریب رہنا بہت ضروری تھا۔ اس کے لیے بار بار تقریباً ہر ہفتے حکومت سے مشورہ کرنا اور ہدایات اور اجازت لینا ضروری تھا۔ ہمیں ایک بڑے ایئر پورٹ کی ضرورت تھی جو اسلام آباد میں موجود تھا۔ ہمیں ایک بہت بڑے شہر کی ضرورت تھی جہاں ہمارے سائنس دان اور انجینئر آرام سے رہ کر، اپنے بچوں کی تعلیم اور اپنے خاندان کی صحت اور علاج سے بے فکر ہو کر کام کر سکیں۔ میرے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ میرے سائنسدان اور انجینئر زگھر کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنی تمام توجہ پراجیکٹ پر دے سکیں اور یہی نکتہ کہوٹہ کو منتخب کرتے وقت ہمارے ذہنوں میں تھا۔

ہم نے کہوٹہ میں جولائی ۷۶ء سے کام شروع کر دیا۔ میں نے مرحوم صدر جنرل ضیاء الحق صاحب سے (جو اس وقت چیف آف آرمی

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

سٹاف تھے) درخواست کی کہ مجھے فوج سے انجینئرز کی ایک ٹیم دے دی جائے تا کہ تعمیر کا کام ہم فوجیوں سے کرا سکیں۔ مجھ سے اس کا سبب پوچھا گیا تو میں نے کہا ''اس کی دو وجوہات ہیں'' ایک تو یہ کہ ہم بہت تیزی سے کام کرانا چاہتے ہیں، دوسرے یہ کہ فوجیوں پر آپ کی نگرانی ہوگی اور سیکورٹی کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور اگر انہوں نے تعمیر کے کام میں کوئی گڑبڑ کی تو آپ کا ڈنڈا ان کے سر پر رہے گا''

جنرل زاہد علی اکبر اس وقت بریگیڈیئر تھے ان کی قیادت میں ایک ٹیم مجھے دے دی گئی جس میں آج کل کے ڈی جی بریگیڈیئر سجاول بھی تھے جو اس وقت لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ اس ٹیم نے جس تیزی سے کام کیا وہ پاکستان کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ہم نے جنرل صاحب سے یہ بھی درخواست کی کہ ہمیں فوج کے کچھ فنی ماہرین دے دیے جائیں چنانچہ ہمیں ای ایم ای کور سے تین کرنل دیے گئے جو نہایت تجربہ کار اور ہنر مند تھے۔ ایک صاحب رحلت فرما گئے ایک ریٹائرڈ ہو گئے اور ایک ماشاءاللہ اب بھی ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس طریقے سے ہم نے پراجیکٹ کی بنیاد ڈالی، اب ہمارے سامنے دو مراحل تھے۔ ایک مین پاور تیار کرنا، دوسرے کام کی رفتار تیز کرنا۔ آپ یقین کریں کہ ہم نے چکلالہ کے قریب ایک چھوٹی سی جگہ لے کر یہ کام شروع کر دیا۔ میں اور میرے ساتھی یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ہمیں ہر حال میں اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ مجھ سے جب بھی کسی نے یہ سوال کیا کہ کیا یہ کام ہو سکتا ہے تو مجھے بہت ہی غصہ آیا۔ میں جواب دیتا۔ آپ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کام کب تک ہوگا۔ یہ سوال نہ کیجیے کہ یہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ جہاں تک اس منصوبے کی وسعت کا تعلق ہے اس سلسلے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اسکی عمارات تقریباً ۱۷۵ ایکڑ پر پھیلی ہوئی ہیں اور اس میں تقریباً سات ہزار آدمی کام کرتے ہیں جن میں سے ایک ہزار سائنٹسٹ انجینئرز ہیں۔ ایسا پراجیکٹ اتنے کم عرصے میں تیار کرنا معمولی بات نہ تھی۔ جب ہم تعمیر کا کام کر رہے تھے اس وقت غیر ملکی سفارت کار یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ پاکستان نیوکلیئر فیلڈ میں کیا کر رہا ہے۔ دراصل ۹۷ء کے اواخر میں انگلینڈ میں یہ بات لیک آؤٹ ہو گئی کہ ہم وہاں سے کچھ ایسا سامان خرید رہے ہیں جو یورینیم کی افزودگی کے کام آتا ہے۔ اس مسئلے پر وہاں بہت شور مچایا گیا۔ اس کے بعد ہی ایک مشہور زمانہ فلم (جسے بدنام زمانہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا) ''پراجیکٹ ۷۰۶ دی اسلامک بم'' کے نام سے بنی اور پوری دنیا میں دکھائی گئی۔ اس کے ساتھ ہی بیرون ملک میں ایک کتاب بھی شائع ہوئی جس میں ہمارے اپنے ہی لوگوں میں سے کئی ایک نے ملک سے غداری کر کے بہت سے انکشافات کیے۔

بہر حال جب تہران میں ایرانیوں نے امریکن سفارت خانہ پر قبضہ کیا اور وہاں سے جو کاغذات نکلے، ان میں اسلام آباد میں فرانس کے فرسٹ سیکرٹری فوکر کی رپورٹ بھی تھی۔ یہ ''فوکر'' وہی تھا جس کو اس کے سفیر کے ساتھ ہم نے کمبل ٹریٹمنٹ دیا تھا۔ یہ بار بار کہوٹہ جانے کی کوشش کرتا تھا۔ جب ہم نے صدر محترم 'ضیاء الحق' (شہید) سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ بہت ہو چکا اب آپ اسے کمبل ہی اوڑھا دیں۔ سو ایک دن جب فرانسیسی سفیر اپنے فرسٹ سیکرٹری کے ساتھ وہاں پہنچا تو ہمارے سیکورٹی کے آدمیوں نے انہیں کمبل اوڑھا کر خوب پٹائی کی۔ اس کے بعد سے آج تک کسی غیر ملکی سفارت کار یا اس کے نمائندے نے کہوٹہ کا رخ کرنے کی جسارت نہیں کی۔ اس ''فوکر'' کی رپورٹ میں درج تھا ''کہوٹہ میں کوئی غیر معمولی چیز بن رہی ہے۔ وہاں کام کی روز بروز پیش رفت پاکستانی پیمانے سے ہٹ کر ہے اور کوئی بھی اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ اب تک کیا کچھ کر چکے ہیں'' یوں دشمن بھی مان گیا تھا کہ کہوٹہ میں کام کی پیش رفت اس تیزی سے ہو رہی تھی جو

پاکستان کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

۱۹۷۶ء میں ہم نے وہاں بنیادیں ڈالنا شروع کی تھیں اور ۱۹۸۰ء میں پورا پلانٹ بنالیا۔ ساتھ ساتھ ہم چکلالہ میں بھی تجربات کر رہے تھے۔ ۷۸ء میں تقریباً دو سال بعد ہم نے پہلی سینٹری فیوج مشین چلائی جس میں یورینیم کی افزودگی شروع کر دی۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں ایک یادگار دن رہے گا۔ وہ لوگ جو اچھا کیل بھی نہیں بنا سکتے تھے، وہ لوگ جو آج تک سلائی کی سوئی نہیں بنا سکے، وہ لوگ جو اچھی بائیسکل نہیں بنا سکتے تھے، انہوں نے ایک ایسا کام کر دکھایا جس سے دنیا حیران رہ گئی۔ پہلے تو انہیں یہ شک رہا کہ ہم غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں اور کروڑوں روپیہ ضائع کر کے چپ ہو کر بیٹھ جائیں گے لیکن دھیرے دھیرے جب تمام puzzles اپنی جگہ پر بیٹھنے لگے تو بقول خود ان کے ''ان کی ہوا نکل گئی'' اور انہیں یہ احساس ہوا کہ واقعی پاکستان نے اس کام میں ان کو مات کر دیا ہے۔ آپ یقین کیجئے اس سلسلے میں ہم نے ضرورت سے زیادہ عقلمندی دکھائی۔

میرے لئے یہ سہولت تھی کہ حکومت نے فری ہینڈ دیا ہوا تھا۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر چیز ہوائی جہاز سے منوائیں گے تا کہ کام میں تیزی سے پیش رفت ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ کیا کہ ہر چیز جس کی ہمیں ضرورت تھی یا جس کی آئندہ چند برسوں میں ضرورت پڑ سکتی تھی وہ فوری طور پر منگائی۔ اس کا آرڈر ایک جگہ نہیں بلکہ دو تین جگہ دیا جائے۔ اکثر ہوتا یہ تھا کہ مغربی ممالک کوئی ایک چیز روک کر بے حد خوش ہوتے اور ہم نے اسے پکڑ لیا ہے۔ لیکن اسی دن وہ چیز اتنی ہی مقدار یا اس سے زیادہ مقدار میں اسلام آباد یا کراچی ایئر پورٹ پر اتاری جا رہی ہوتی تھی۔ آپ نے میرا جنگ سٹیل کی کہانی سنی ہوگی جس دن وہ شور مچا رہے تھے کہ ہم نے میراجنگ سٹیل روک لیا ہے اور ایک پاکستانی کو بھی پکڑ لیا ہے وغیرہ وغیرہ، اس دن کراچی میں دو سوٹن میراجنگ سٹیل اتارا جا رہا تھا۔ اس سلسلہ میں میرے ساتھیوں کا اور میرا تجربہ بہت ہی کام آیا۔ ہم لوگوں نے باہر تعلیم حاصل کی تھی اور ان کی عادات واطوار اور نفسیات سے پوری طرح واقف تھے۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ انہیں کس طرح خریدا جا سکتا ہے ان کے متعلق ایک کہاوت ہے... ''ہم نے ان کی اس کمزوری سے پورا فائدہ اٹھایا۔ وہی لوگ جو وہاں ہمارے خلاف باتیں کرتے تھے، بعد میں چھپ کر ہمیں سامان پہنچاتے تھے''

۱۹۸۱ء میں جب صدر محترم کہوٹہ تشریف لائے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ اسلام آباد کے اتنے قریب اتنا بڑا پلانٹ تعمیر کر دیا گیا ہے۔ وہ مجھ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس پراجیکٹ کو میرے نام منسوب کر دیا۔ یہ بڑا خراج تحسین تھا کہ اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ کسی بھی زندہ سائنسدان کے لیے یہ ایسا اعزاز ہے کہ وہ اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ یقیناً یہ کسی اکیلے ایک آدمی کا کام نہیں تھا ہم سب نے مل کے ٹیم ورک کی صورت میں کام کیا تھا اور یقین کیجئے کہ جس تندہی، محنت اور ملک کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر میرے ساتھیوں نے یہ کام انجام دیا ہے اس کی مثال آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ ہم لوگ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتے صبح وہاں جاتے اور شام کو صرف ایک گھنٹے کے لیے گھر آتے، کھانا کھاتے اور سب کی خیریت دریافت کرنے کے بعد واپس پلانٹ پر چلے جاتے۔ ہمیں گھنٹہ آدھا گھنٹہ سے زیادہ آرام نہیں ملتا تھا۔ اس طریقے سے ہم یورینیم کی افزودگی کا کام جاری رکھے ہوئے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ اس سے صنعتی ترقی کے لیے بجلی پیدا کی جائے گی اور اگر ضرورت پڑے تو اسے دفاعی کاموں کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ تقسیم کچھ اس طرح سے ہوئی تھی کہ ہم یورینیم کی افزودگی کریں گے اور

انرجی کمیشن ری ایکٹر بنائے گا۔ ۸۱ء میں ہمارا پلانٹ کافی حد تک مکمل ہوگیا اور جب مرحوم صدر ضیاء نے اس کو دیکھا تو یہ ایک حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔ اس دوران میں مغربی ممالک کی طرف سے ہالینڈ پر بہت دباؤ ڈالا گیا کہ اس نے مجھے وہاں کام کرنے کی اجازت کیوں دی اور یہ کہ کسی بہانے مجھ پر مقدمہ چلایا جائے۔ میں جب یہاں آیا تو ہمارے پاس کوئی لائبریری نہیں تھی۔ میں نے اس کے لیے اپنے ایک پرانے ساتھی کو دو خط لکھے کہ ہم وہاں کیمیکل پراسیسنگ کا جو کام کرتے تھے اس کے بارے میں کچھ معلومات اگر ممکن ہو تو مجھے بھیج دے۔ اس کا تو مجھے کوئی جواب نہ آیا مگر ان خطوط کو بنیاد بنا کر ۸۴ء میں انہوں نے مجھ پر مقدمہ بنایا کہ آپ یہاں سے خفیہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں اور پھر مجھے میری غیر موجودگی میں چار سال سزا دے دی گئی۔ اس میں اسرائیل کا بہت بڑا ہاتھ تھا کیونکہ ہالینڈ والے اسرائیل کے اتنے ہمدرد ہیں کہ ان کو عرف عام میں ''یہودیوں کا غلام'' کہا جاتا ہے۔

یہاں اپنے ملک میں یہ خیال تھا کہ اگر انہوں نے مقدمہ کر دیا اور سزا مل گئی تو آپ کا کیا جاتا ہے آپ تو نیشنل ہیرو ہیں، اس مقدمے کو بھول جائیے۔ میں نے کہا دیکھئے تاریخ یہ بھول جائے گی کہ میں نے کام کیا مگر ہمیشہ مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے یاد کرے گی کہ یہ ایک مجرم تھا، جاسوس تھا، اسے چار سال کی سزا ہوئی تھی اور یہ اس کی اولاد ہے۔ چنانچہ ہم نے وہاں اپیل دائر کر دی۔ ایس ایم ظفر صاحب میرے وکیل مقرر ہوئے۔ یہاں پھر ملکی مفاد نظر انداز کر کے یہ شگوفہ چھوڑا گیا کہ ظفر صاحب کا تعلق تو اپوزیشن سے ہے اور جو فیس انہیں ملے گی وہ ہمارے خلاف انتخاب لڑنے میں استعمال کریں گے۔ میرا جواب یہ تھا کہ وکیل کو میرا مقدمہ لڑنا ہے مجھے ان پر بھروسہ ہونا چاہئے اور اگر آپ اس بات سے متفق نہیں تو میں یہ نوکری اور ملک چھوڑ کر باہر بیٹھ جاؤں گا اور مقدمہ پھر بھی ظفر صاحب ہی لڑیں گے۔ بعد میں مقدمہ کے فیصلے نے ثابت کر دیا کہ ظفر صاحب پر میرا اعتماد کتنا درست اور صحیح تھا۔ ہمارے ڈچ وکلاء نے یہ مانا اور لکھ دیا کہ جو نظریہ ظفر صاحب نے پیش کیا، وہ بالکل صحیح تھا اور جج اور عدالت نے وہی نظریہ قبول کیا۔

۱۰ جنوری ۱۹۹۴ء کو میں نے اس مقدمے کے سلسلے میں نوائے وقت کو ایک انٹرویو دیا جس میں پہلی مرتبہ یہ اعتراف کیا کہ پاکستان نے مغربی ممالک کی اجارہ داری ختم کر دی ہے۔ یہ ایسا بم شیل تھا جس نے دہلی سے لے کر واشنگٹن تک سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ یقین کیجیے وہ باتیں اور شامیں تاریخ کا حصہ بننے کے قابل ہیں جو اس کے تین چار دن بعد گزریں۔

واشنگٹن میں ہمارے سفیر اور ہمارے فارن آفس کے درمیان جو بات چیت ہوئی اور جو رابطے قائم ہوئے وہ ناقابل ذکر ہیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں اس انٹرویو سے منحرف ہو جاؤں مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ ایسے ایڈیٹر نے جس کی ساکھ قائم ہے، یہ انٹرویو شائع کیا ہے، میں ان کو جھوٹا ثابت نہیں کر سکتا۔ مجھ سے کہا گیا کہ ہم اس کی تردید کر دیتے ہیں آپ چپ رہیں، میں نے عرض کی میں اپنے ہاتھ سے تحریر کردہ خط اس اخبار میں شائع کرا دوں گا کہ جو کچھ اس میں چھپا ہے وہ صحیح ہے اور لوگ اس سے جو نتیجہ اخذ کر رہے ہیں وہ غلط ہے۔ ہم نے صرف یورینیم کی افزودگی کے لیے جو مہارت حاصل کی وہ ہمارے پرامن پروگرام کے لیے ہے اور اگر لوگ اس کا غلط مطلب لیتے ہیں تو یہ ان کی اپنی مرضی ہے۔ اس طرح یہ بات بڑی مشکل سے ٹالی گئی۔ بہرحال یورینیم کی افزودگی کا کام جاری رہا اور پورے مغرب اور انڈیا کا پریشر قائم رہا کہ یہ افزودگی یورینیم

آپ کہاں استعمال کریں گے۔اس کا آپ کے پاس جواز نہیں اس کی آپ کو ضرورت نہیں اور آپ جو افزودگی یورینیم بنارہے ہیں وہ کہاں جارہا ہے۔

دراصل اٹامک انرجی کمیشن کو ری ایکٹر بنانا تھا۔اگر ایک چھوٹا ساری ایکٹر بھی اس دوران میں تیار کیا جاتا جس میں ہم افزودہ یورینیم استعمال کرسکتے تو ہماری تمام مشکلات کم ازکم سطحی طور پر دور ہوجاتیں۔ نیوکلیئر پاور پیدا کرنے والے ممالک میں پاکستان کی پوزیشن تقریباً صفر پر ہے۔ہمارا کراچی کا واحد نیوکلیئر پاور ری ایکٹر صرف ۱۳۷ میگاواٹ بجلی تیار کرتا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر آپ امریکہ فرانس روس، جاپان، جرمنی اور انگلینڈ وغیرہ کو چھوڑ بھی دیں تو بہت ایسے چھوٹے ممالک سپین، کوریا، بیجیئم ،تائیوان، فن لینڈ، ہنگری اور انڈیا وغیرہ ایسے ہیں جو اس فیلڈ میں ہم سے کہیں آگے ہیں۔ ارجنٹائن ۴۵ے میگاواٹ، کوریا ۷۰۰ میگاواٹ اور تائیوان جیسا چھوٹا سا ملک ۵۰۰۰ میگاواٹ اور ایٹمی توانائی کی جو کم ازکم ضرورت ہے وہ ۵۰۰۰ میگاواٹ ہے۔

اٹامک انرجی کمیشن کی طرف سے جو منصوبہ پیش کیے گئے ہیں، ان میں ۱۹۹۶ء میں جو پراجیکٹ مکمل ہوگا اس کا تعلق چین کے ۳۰۰ میگا واٹ ری ایکٹر سے ہے اور اس سلسلے میں بات چیت جاری ہے دوسرا ۱۹۹۷ء میں چالو ہونے والا ۹۰۰ میگاواٹ کا فرانسیسی ری ایکٹر ہے اس کے بعد ۹۸ء میں ایک ری ایکٹر لگے گا۔ان کے متعلق بہت سی توقعات وابستہ کی گئی ہیں لیکن جاننے والوں کو ہرگز امید نہیں کہ ہم یہ ٹارگٹ beat کرسکیں گے۔۱۹۹۷ء میں فرانس کا ۹۰۰ میگاواٹ کا ری ایکٹر لگنا تقریباً ممکن ہے۔

ہمارا ہدف یہ ہے کہ ہم اس صدی کے اختتام پر توانائی کی ۱۵ فیصد ضروریات نیوکلیئر انرجی سے پوری کریں گے اور باقی دوسرے ذرائع سے اس طرح ہمیں ۶۰۰۰ میگاواٹ نیوکلیئر پاور کی ضرورت پڑے گی۔

ہمارے نیوکلیئر پروگرام کے جو مقاصد ہیں وہ دو طرح کے ہیں۔ایک تو یہ کہ ہم نیوکلیئر انرجی بنائیں۔دوسرے ہم کہیں یا نہ کہیں، استعمال کریں یا نہ کریں لیکن اس کا بدیہی اور بوقت ضرورت جو استعمال ہے، وہ یقیناً ملک کے دفاع کے لیے ہے۔تو جو بھی نیوکلیئر صلاحیت ہمیں حاصل کرنی ہے وہ دو طرفہ ہونا ضروری ہے۔اس کام کے لیے ”ادارے“ اٹامک انرجی کمیشن اور ہماری لیبارٹریز ہیں یہ دونوں خودمختار اور مساوی اور آزادانہ حیثیت کے حامل ادارے ہیں۔ایٹمی کمیشن ۱۹۵۶ء میں بنا تھا۔اس کے پہلے چیئرمین ڈاکٹر نذیر احمد تھے، وہ تھوڑا عرصہ رہے۔اس وقت ایٹمی کمیشن کو اہمیت دی گئی اور انہوں نے لوگوں کو امریکہ، کنیڈا، آسٹریلیا، انگلینڈ اور فرانس وغیرہ بھیجا اور جتنے اچھے سائنٹسٹ پاکستان میں پیدا ہوئے وہ اسی دور کی پیداوار ہیں۔

ہمارا پراجیکٹ ستمبر ۱۹۷۶ء میں بنا تھا۔ ہمارا کام یورینیم کی افزودگی تھا اور اس کے لیے جو طریقہ کار ہم نے اختیار کیا وہ گیس سینٹری فیوج میتھڈ تھا۔یہ دنیا کا مشکل ترین طریقہ ہے مگر اس کے جو فوائد ہیں وہ اتنے اہم ہیں کہ ہر ملک اسے اپنانے کا خواہاں ہے۔اس سے جو افزودگی ہوتی ہے وہ دوسرے طریقہ کار کے مقابلے میں چالیس، پچاس گنا زیادہ ہے اور اس پر صرف ہونے والی بجلی بھی دوسرے طریقوں میں استعمال ہونے والی بجلی کا دسواں حصہ ہے۔

پھر ایسا پلانٹ نصب کرنے کی لاگت بھی دوسروں سے کم ہے۔ اٹامک انرجی کمیشن والوں کا کام تھا کہ ری ایکٹر بنائیں اور ڈیفنس کے

لیے ضرورت پڑے تو اس میں ہاتھ بٹائیں۔ جبکہ ہمارا کام یہ تھا کہ یورینیم کو افزودہ کریں اور پلانٹ بنائیں۔ ہم نے یہاں جتنا بھی کام کیا وہ پاکستان ہی کے انجینئروں اور سائنس دانوں نے کیا اور اس میں کسی غیر ملکی سے مدد نہیں لی گئی کیونکہ ہم کسی کو احساس بھی نہیں دلانا چاہتے تھے کہ ہم یورینیم کی افزودگی کا کام کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب غیر ممالک کو اس کام کا علم ہوا تو انہیں یقین ہی نہیں آیا۔ دنیا میں سات، آٹھ ممالک یورینیم کی افزودگی کی مہارت رکھتے ہیں پانچ سپر طاقتوں کے علاوہ جرمنی، ہالینڈ اور کہیں تھوڑا سا کام جاپان نے کیا ہے اور جس وقت ہم نے یہ کیا، اس وقت جاپان بھی نہیں کرتا تھا تو اس طرح پاکستان دنیا کے آٹھ ممالک میں سے ایک تھا جس نے یہ مہارت حاصل کی۔ جب میں نے یہ کام شروع کیا تو ہمارے لیے ملکی خزانے کے دروازے نہیں کھول دیئے گئے کہ آیئے اور آکر جتنا پیسہ چاہیں لے لیجئے۔ اگر میں آج یہ کہوں تو اسے ذاتی شہرت پر محمول نہ کیا جائے کہ مجھے پہلی تنخواہ چھ مہینے بعد دی گئی جو تین ہزار روپے تھی جبکہ باہر ملک میں تیس ہزار روپے ماہوار پر کام کرتا تھا۔ میرے تمام ساتھی، جواب بھی میرے ساتھ ہیں، اس وقت ڈھائی، ڈھائی، تین تین ہزار روپے لیتے تھے اور اگر آج یہ لوگ باہر جائیں تو تیس چالیس ہزار روپے تو لوگ ان کے قدم چوم کر انہیں دینے کو تیار ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی آدمی میرا پراجیکٹ چھوڑ کر نہیں گیا بلکہ جو بھی یہاں آیا، اسے احساس ہوا کہ یہاں ملکی مفاد کے لیے کام ہو رہا ہے۔

اب ہم افزودگی یورینیم ہی تیار کر رہے بلکہ ڈیفنس کے اور اس کے علاوہ بھی بہت سے کام ہم کہوٹہ میں کر رہے ہیں۔ کہوٹہ مکمل پاکستانی پراجیکٹ ہے جو صرف پاکستانیوں کے لیے بنایا ہے اور پاکستانیوں میں یہ صلاحیت ہے کہ ایسے سو پلانٹ مزید لگا سکتے ہیں اور اس کے لیے ہم کسی کے بھی محتاج نہیں ہیں۔ جب افزودگی کے بارے میں ہمارا کام مکمل ہو گیا تو ہم نے صدر محترم سے درخواست کی اگر کوئی اور کام آپ ہمیں دینا چاہیں تو اس کے لیے بھی ہم تیار ہیں، تب ہمیں شولڈر فائر میزائل کا کام دیا گیا وہ ہم افواج پاکستان کو مہیا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے لیزر رینج فائنڈر بنا کر دیئے ہیں، ملٹی بیرل راکٹ لانچر بنائے ہیں اور آج کل اینٹی ٹینک میزائلز پر بھی کام کر رہے ہیں۔

کلدیپ نیئر کے جس انٹرویو کا ذکر کیا جاتا ہے وہ انٹرویو قطعاً نہیں تھا۔ کلدیپ نیئر مشاہد حسین صاحب کے ساتھ آیا ضرور تھا مگر ہم نے بیٹھ کر صرف چائے پی لی تھی تاہم ایک بات میں نے جتا دی تھی جب اس نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی کہ آپ نیوکلیئر پاور فیلڈ میں کام کر رہے ہیں اور بھارت آپ سے دس گنا بڑا ہے اگر آپ ایک بنائیں گے تو وہ دس بنائے گا تو میں نے جواب دیا کہ نیئر صاحب آپ کو سو بموں کی ضرورت نہیں، صرف تین بم چاہیے۔ کراچی اور اسلام آباد کے لیے اور پاکستان کو بھی آپ کے لیے سو بموں کی ضرورت نہیں صرف چار پانچ کی ضرورت ہے۔ دہلی، بمبئی، کلکتہ اور مدراس کے لیے۔ ہمیں یقین ہے آپ تین بم نہایت آسانی سے بنا سکتے ہیں۔ اور ہم بھی آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ چار پانچ بم بنانا ہمارے لیے بھی کوئی مشکل نہیں تو آئندہ اگر آپ نے کسی قسم کی شرارت کی تو اسکا منہ توڑ جواب دیا جائے گا۔

یہ تھا انٹرویو کا لب لباب، اللہ تعالیٰ کو جو منظور ہوتا ہے، وہ کام کسی نہ کسی طرح کرا لیتا ہے انڈیا والوں کے نام ہمارا پیغام بھی ایسے وقت پہنچ گیا جب وہ ہمارے خلاف جارحیت کا منصوبہ بنا رہے تھے اور ممکن ہے اس سے ان کے ارادے بدل گئے ہوں۔

''بھٹو، ضیاء الحق اور کہوٹہ''

پچھلے دنوں ہمارے قابل احترام تجزیہ نگار اور پرانے سول عہدیدار جناب شفقت محمود نے روزنامہ نیوز میں 5 جولائی 1977ء کے واقعات کے بارے میں کچھ تحریر فرمایا ہے۔ آپ مری اسسٹنٹ کمشنر کے فرائض کے انجام دے رہے تھے جہاں پر جنرل ضیاء الحق نے بھٹو صاحب کو نظر بند کیا تھا۔ آپ نے وہاں جنرل ضیاء الحق، جناب غلام اسحٰق خان صاحب اور جنرل عارف کی آمد اور بھٹو صاحب سے ملاقات کا ذکر فرمایا ہے۔ آپ نے غلام اسحٰق خان کے رویہ کے بارے میں تبصرہ فرمایا ہے۔ جناب شفقت محمود ایک نہایت قابلِ اعتبار شخصیت ہیں اور میں ان کے تاثرات کے بارے میں شک کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ صرف معروضات حاضر خدمت ہیں۔ جب 1976ء میں جناب بھٹو صاحب کی درخواست پر میں پاکستان میں ٹھہر کر کام کرنے پر راضی ہوگیا تو بھٹو صاحب، جناب اے جی این قاضی صاحب (سیکرٹری جنرل فنانس) جناب غلام اسحاق خان صاحب (سیکرٹری جنرل ڈیفنس) اور جناب آغا شاہی صاحب (سیکرٹری جنرل خارجہ) سے باقاعدگی سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ماحول ہمیشہ نہایت ہی اچھا اور دوستانہ ہوتا تھا۔ پہلی ہی میٹنگ میں چند منٹ بعد غلام اسحٰق خان نے بھٹو صاحب کی جانب دیکھا اور پوچھا سر اجازت ہے اور دونوں انگلیاں اٹھا کر سگریٹ پینے کی اجازت چاہی۔ بھٹو صاحب مسکرا کر کہا ہاں خان صاحب، ساتھ ہی خود بھی سگار نکال کر سلگا لیا کہ خان صاحب کو سکون سے سگریٹ نوشی کرسکیں۔ اس کے بعد میں نے ہمیشہ ان تینوں کو بھٹو صاحب سے لاتعداد ملاقاتیں کرتے دیکھیں اور کبھی بھی یہ تاثر نہ پایا کہ ان میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا تناؤ موجود ہو۔ میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ اس فوجی قبضہ کے بعد غلام اسحٰق خان صاحب یقیناً ایک ''شاک اسٹیٹ'' میں ہوں گے اور ضیاء الحق صاحب کے ساتھ جانے سے ان کو یہ احساس ہوگا کہ بھٹو صاحب شاید یہ شک کریں گے کہ وہ اس سازش کا حصہ ہیں۔ اپنے تجربہ اور سنیارٹی کی وجہ سے ضیاء الحق نے ان کو سب سے بہتر اور مناسب افسر سمجھا ہوگا اور ان کو ساتھ ملا لیا ہوگا۔

قبل اس کے کہ اس موضوع پر مزید بات کروں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مارشل لاء لگتے ہی ہمارا باقاعدگی سے جنرل ضیاء سے رابطہ ہونے لگا۔ ان کے ایک پرانے ساتھی لیفٹیننٹ جنرل ضامن نقوی کو انہوں نے مشیر سیکورٹی لگا کر اٹیمی پروگرام کی حفاظت کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ جنرل ضیاء ہمیشہ جنرل ضامن کو کہتے تھے اور بہت عزت کرتے تھے۔ جنرل نقوی بے حد شریف انسان تھے اور ہم دونوں اکثر رات کو جنرل ضیاء سے ملنے جایا کرتے تھے۔ مارشل لاء کے بعد ہمارے بورڈ کی میٹنگ میں جناب قاضی صاحب کے بجائے جنرل عارف نے شرکت شروع کردی تھی اور وہ اس طرح جنرل ضیاء کو حالات سے مطلع کرتے رہتے تھے۔ جنرل عارف ایک نہایت قابل اور اعلیٰ عقل وفہم کے مالک تھے۔ بات کم کرتے تھے اور یادداشت بے حد اچھی تھی، جنرل ضیاء کی کامیابی کی وجہ جنرل عارف کی کارکردگی تھی۔ فوج اور ملک کی بدقسمتی رہی کہ جنرل ضیاء نے جنرل عارف کی اعلیٰ کارکردگی اور عقل وفہم کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر کے اپنے دور کو طوالت دی۔ جنرل عارف کو اگر بڑی ذمہ داری دی جاتی تو یقیناً وہ اس کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر کے نام پیدا کر جاتے۔

اب آپ کو دو دلچسپ واقعات بتلانا چاہتا ہوں۔ جناب غلام اسحٰق خان صاحب سے میرے بہت اچھے تعلقات تھے، میں ان کی عزت اپنے والد کی طرح کرتا تھا اور مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ وہ بھی مجھے بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ مجھے اجازت تھی کہ جب چاہوں ان سے مل

لوں۔ عموماً میں صبح ۹ بجے ان کے گھر چلا جایا کرتا تھا اور اس وقت پرانے چائنا مارکیٹ کے قریب کرائے کے گھر میں رہتے تھے، نہ گارڈ نہ سپاہی۔ میں جا گھنٹی بجاتا اور انکے ایک بزرگ ملازم مجھے اندر بٹھا کر چائے دے جاتے اور کچھ دیر میں خان صاحب تشریف لے آتے، کام کی باتیں کر کے میں دفتر چلا جاتا۔ میں اِدھر اُدھر سے افواہیں سنیں تھیں کہ ضیاء الحق کے ایکشن کا غالباً خان صاحب کو پہلے سے علم تھا۔ میں نے ایک دن اُن سے دریافت کر ہی لیا۔ اُنہوں نے بتلایا کہ اُنہیں اس کا قطعی علم نہ تھا اور بھنک تک نہیں پڑی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ۵ جولائی کو حسب معمول صبح باتھ روم میں تھے اور جب باہر آیا تو بیگم نے بتایا کہ جی۔ ایچ۔ کیو سے فون آیا تھا اور جنرل ضیاء الحق بات کرنا چاہتے تھے اور میں نے بتلا دیا کہ باتھ روم سے باہر آئیں گے تو بتلا دوں گی۔ اس وقت تک خان صاحب کو حکومت کا تختہ الٹنے کا کچھ علم نہ تھا۔ اُنہوں نے جنرل ضیاء صاحب کو فون کیا تو جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ خان صاحب ہم نے حکومت کا نظام سنبھال لیا ہے اور وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو اور اسمبلیوں کو برخاست کر دیا ہے۔ آپ جی۔ ایچ۔ کیو آ جائیں مشورہ کرنا ہے۔ جب خان صاحب وہاں پہنچے تو گفتگو کے شروع میں خان صاحب نے کہا کہ جو کچھ ہوا وہ ملک کے مستقبل کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ مگر اب آپ جبکہ یہ اقدام اٹھا چکے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ حالات سنبھالنے اور بہتر طریقہ سے چلانے کی کوشش کریں۔ جنرل ضیاء الحق نے ان کو جلد ہی سیکرٹری جنرل انچیف بنا دیا اور اس طرح وہ ڈی فیکٹو وزیر اعظم بن گئے۔ میں نے بذات خود کئی مرتبہ دیکھا کہ وہ جنرل ضیاء الحق سے اختلاف رائے کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔

اب پہلا دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ جون ۱۹۷۶ میں جب کہوٹہ پراجیکٹ کو اٹامک انرجی کمیشن سے بالکل علیحٰدہ کر کے مجھے اس کا سربراہ مقرر کر دیا گیا تو میری سب سے بڑی ترجیح پلانٹ کے لیے مناسب جگہ کی تلاش تھی۔ لاتعداد جگہیں دیکھ کر اور تمام اہم نقطہ جات کو مدنظر رکھ کر میں نے فیصلہ کیا کہ کہوٹہ سب سے مناسب جگہ ہے (بعد کے حالات نے اس فیصلہ کو صحیح ثابت کر دیا) میٹنگ میں جس میں جناب بھٹو، غلام اسحٰق خان صاحب، جناب اے۔ جی این قاضی صاحب، آغا شاہی صاحب، جنرل ضیاء الحق، منیر احمد خان اور میں موجود تھے، میں نے بھٹو صاحب کے پوچھنے پر بتلایا کہ کہوٹہ کی سائیٹ چن لی گئی ہے اور وہ ہر لحاظ سے بہت مناسب جگہ ہے تو غلام اسحٰق خان صاحب نے کہا سر ایک کمیٹی بنا دیتے ہیں جو اسکا معائنہ کر لے اور پھر فیصلہ کر لیں۔ بھٹو صاحب نے خان صاحب کی طرف دیکھا، مسکرائے اور کہا کہ خان صاحب ان کمیٹیوں نے ملک کو تباہ کر دیا ہے نہ میں اس معاملے میں کچھ جانتا ہوں اور نہ آپ، اگر ڈاکٹر خان نے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر یہ جگہ پسند کی ہے تو ہمیں کیا اعتراض ہے وہ اپنے کام سے واقف ہیں۔ ہمارے لیے ان کا فیصلہ قابل قبول ہے اور معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔ بھٹو صاحب نے پوچھا کہ کیا میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں تو میں نے عرض کی کہ مجھے فوج کی انجینئرنگ کور کی ایک ٹیم دے دی جائے۔ بھٹو صاحب نے تعجب سے پوچھا وہ کس لیے، میں نے عرض کی کہ پلانٹ کی تعمیر کا کام بہت بڑا ہوگا۔ مجھے علم ہے کہ پاکستان میں سول ورکس میں پچاس فیصد رشوت ستانی عام ہے میں اس سے بچنا چاہتا ہوں۔ اگر فوجیوں نے گڑبڑ کی تو آرمی چیف خود ہی نمٹ لیں گے۔ دوئم مجھے کام بہت تیزی سے کرانا ہے۔ بھٹو صاحب نے جنرل ضیاء کی طرف دیکھا اور کہا کہ جنرل صاحب آپ اس کا بندوبست کر دیں۔ میٹنگ کے بعد جب ہم باہر آئے تو جنرل ضیاء نے مجھ سے کہا کہ کس رینک کا افسر چاہئے۔ میں نے کہا کہ کم از کم بریگیڈیر تا کہ وہ حکومت کے اداروں سے کام لے سکے۔ انہوں نے کہا کل صبح ۹ بجے آپ کے پاس آفیسر پہنچ جائے گا۔ دوسرے دن پورے ۹ بجے

بریگیڈیر زاہد علی اکبر خان صاحب نے میرے پاس رپورٹ کی۔ یہ دراز قد اور نہایت وجیہ افسر تھے اور آتے ہی کہا خان صاحب مجھے کہاں مروا دیا میں سپاہی آدمی فرنٹ پر ہونا چاہتا ہوں۔ جب میں نے کام کی نوعیت کا بتایا تو بہت خوش ہوئے، ہم نے پہلے جیپ اور پھر ہیلی کاپٹر سے کہوٹہ کے علاقہ کا دورہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے پورے علاقے کا نقشہ بنا کر سیکرٹری ڈیفنس جنرل فضل مقیم خان سے جو نہایت نفیس اور تیز کام کرنے والے افسر تھے، اس پورے علاقے کو دفاع کے لیے حاصل کرلیا۔ میں نے ایک شرط رکھی کہ معاوضہ موجودہ ریٹ سے بہتر اور فوراً ادا کیا جائے گا۔ غلام اسحٰق خان نے یہ رقم فوراً مہیا کر دی۔ خوش قسمتی سے اس علاقہ میں تمام ریٹائرڈ فوجی جوان رہتے تھے۔ ہم نے یہ رقم ان کو اچھا معاوضہ دے کر قریب ہی اچھی زمین دلا دی اور ان سب کو فوراً ملازم رکھ لیا۔ وہاں کبھی کوئی تنازعہ نہیں ہوا۔ جبکہ پچاس سال بعد آج بھی تربیلا ڈیم اور منگلا ڈیم کے متاثرین مارے مارے پھر رہے ہیں۔ آرمی کے انجینئرنگ کور کے افسران نے جو کام سرانجام دیا وہ قابل تقلید اور مثالی تھا۔ انسان ہر روز کام کی ترقی دیکھ سکتا تھا۔ تین سال بعد آئی ایس آئی کے ایک بریگیڈیر صاحب میرے ایک پرانے ساتھی بریگیڈیر پر رشوت ستانی کا الزام لگا رہے تھے میں نے عرض کیا کہ پہلے اپنے گریبانوں میں جھانکیں دوسرے ان تین سالوں میں مجھے آئی ایس آئی، ایم ائی ایف، سی جی ایس وغیرہ یا کسی آرمی چیف وغیرہ کا ایک نوٹ یا ایک شکایت ان کے خلاف پیش کر دیں ورنہ اپنے افسران کے اکاؤنٹ دیکھ لیں جن میں لاکھوں ڈالر پائے گئے ہیں اور ان کے نام کئی کئی بنگلے ہیں۔

ایک دوسرا واقعہ پراجیکٹ کے انچارج کی حیثیت سے میرے اختیارات کا تھا۔ میں نے بریگیڈیر زاہد (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل زاہد) کے ساتھ مل کر ان اختیارات کی فہرست تیار کرلی جو ہمارے خیال میں مجھے پروجیکٹ کو تیزی سے مکمل کرنے کے لیے ضروری تھے جب میں وہ فہرست لے کر غلام اسحٰق خان صاحب، آغا شاہی صاحب اور اے جی این قاضی صاحب کے ساتھ بیٹھا تو نظر ڈالتے ہی خان صاحب نے کہا ڈاکٹر صاحب یہ اختیارات تو ہمارے پاس اور وزراء کے پاس بھی نہیں ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا مجھے اپنے کام کے لیے ان کی ضرورت ہے آپ باقاعدگی سے مجھ پر کڑی نظر رکھ سکتے ہیں کہ ان کا غلط استعمال نہ ہوگا اس پر قاضی صاحب نے کہا کہ اسحٰق خان اگر اور پی ڈبلیوڈی پیدا کرنا چاہتے ہو تو بحث کرو، وزیراعظم کی ہدایت ہے کہ کام میں ہرگز کوئی دشواری نہ ہو، آغا شاہی صاحب نے تائید کی اور مجھے وہ اختیارات مل گئے جو وزیراعظم کے علاوہ کسی کے پاس نہ تھے۔ قاضی صاحب نے غلام اسحٰق خان صاحب سے مشورہ کرکے ایک سیکرٹری کے عہدہ کے افسر جناب امتیاز احمد بھٹی کو وزارت خزانہ سے فوراً پوسٹ کر دیا جن کو میں نے ڈی جی فنانس اور ایڈمنسٹریشن مقرر کر دیا۔ آڈٹ کا کام بھی کرتے تھے اور سیکرٹری فنانس سے باقاعدگی سے ملتے رہتے تھے۔ ہمارے یہاں کبھی کسی مالی بدانتظامی یا گڑبڑ کی شکایت سامنے نہ آئی، یہی افسر تمام اکاؤنٹس چلاتے تھے اور غیر ملکوں میں آرڈر وغیرہ کرتے تھے۔ مجھ سے پورا کیس تیار کرکے اجازت لے لیا کرتے تھے۔ باقاعدگی سے یہی آڈٹ کرایا کرتے تھے۔ بھٹی صاحب کے بعد جناب فخرالدین ملک اور پھر جناب محمد فہیم متین کئے گئے جو دونوں ۲۲ گریڈ کے افسر تھے۔ عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ تقریباً اٹھائیس سال کی رفاقت کے دوران میں نے غلام اسحٰق خان صاحب سے یا آغا شاہی صاحب سے کبھی ایک لفظ جناب بھٹو صاحب کے خلاف نہیں سنا۔ ہم بہت قریب تھے اور کھل کر تمام موضوعات پر گفتگو کر لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جن کی ابتدائی اہم کوششوں سے پاکستان ایک ایٹمی قوت بن گیا جنت الفردوس

میں جگہ عطا فرمائے (آمین) بعد میں جنرل ضیاء الحق، محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ، میاں نواز شریف صاحب اور فوج کے سربراہوں جنرل اسلم بیگ اور جنرل وحید کاکڑ نے بہت اہم رول ادا کیے تھے اللہ تعالیٰ ان کو بھی اس کا صلہ عطا فرمائے گا۔

کتاب گھر کی پیشکش

'تاریخ کہوٹہ۔ پارٹ (1)

http://kitaabghar.com

۳۱ جولائی ۱۹۷۶ء یعنی ۳۳ سال پیشتر جناب شہید ذوالفقار علی بھٹو نے ملک میں یورینیم کی افزودگی کے لیے ایک اہم پروجیکٹ کے قیام کی منظوری دی۔ اس کا قیام جناب اے جی این قاضی، جناب اے جی این قاضی، جناب اے الحق خان، جناب آغا شاہی اور جنرل امتیاز علی کے مشورہ پر عمل میں آیا اور اس کو ایک بالکل خود مختار ادارے کی حیثیت دے دی گئی، اس ادارہ کا نام انجینئرنگ ریسرچ لیبارٹریز رکھا گیا اور مجھے اس کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ کہوٹہ کی تاریخ اور ہمارے کارناموں سے تقریباً پوری قوم واقف ہے مگر چونکہ یہ واقعہ ۳۳ سال پرانا ہے اور نوجوان طبقہ اس کے حقائق سے ناواقف ہے میں اس آرٹیکل کو جو میں نے یکم اگست ۱۹۸۶ء یعنی دس سالہ سالگرہ پر ایک مقامی اخبار میں شائع کیا تھا اس کے اقتباسات قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں تاکہ سب کو اس دلچسپ پرانی تاریخ سے آگاہی حاصل ہو جائے۔

''دس سال پیشتر ہماری حکومت نے انجینئرنگ ریسرچ لیبارٹریز کے نام سے راولپنڈی میں ایک پروجیکٹ شروع کیا۔ جس کا مقصد دنیا کی نہایت اہم اور مشکل ترین سینٹری فیوج کا طریقہ استعمال کر کے یورینیم کی افزودگی کرنا تھا، میں اس مضمون میں اس پروجیکٹ کے ابتدائی مراحل ان کوششوں کے بارے میں عوام کو مطلع کروں گا جن کی مدد سے ہم نے پاکستان کو دنیا کی مشکل ترین ٹیکنالوجی میں خود کفیل بنا دیا۔ کہوٹہ پلانٹ نے پاکستان کو دنیا کے ایٹمی نقشہ پر ایک ممتاز مقام مہیا کر دیا ہے اور مستقبل کے لیے ہمارے پرامن ایٹمی پراگرام میں خود کفالی کی ٹھوس بنیاد تیار کر دی ہے۔ ۳ سے ۵ فیصد افزودہ یورینیم جو ہم تیار کر رہے ہیں وہ ہمارے آئندہ لگائے جانے والے ایٹمی ری ایکٹروں میں ایندھن کے طور پر استعمال ہو گا اور ملک سینکڑوں ملین ڈالر سالانہ زرمبادلہ کی بچت کرے گا اور ہمیں خود کفیل بھی کر دے گا۔

جاپان پر امریکہ کی طرف سے دو ایٹمی بم گرائے جانے کے بعد ایٹمی ہتھیار حاصل کرنے کی دوڑ شروع ہو گئی جو ابھی تک جاری ہے۔ روسی حکومت امریکہ کے اقدامات سے جائز طور پر خوفزدہ تھی اور اپنی خود مختاری کی حفاظت کیلیے انہوں بھی بہت جلد ہی ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنا ڈالے۔ اس کے بعد انگلستان فرانس اور چین نے ان ہتھیاروں کی تیاری شروع کر دی۔ ایک طرف جبکہ ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری جاری تھی تو دوسری طرف یہ کوشش بھی شروع کر دی گئی کہ کسی طرح ایٹم بم کے اندر بند بے انتہا قوت کو بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال کر سکیں۔ امریکہ روس، انگلستان اور کنیڈا ایٹمی ری ایکٹر بنانے میں کامیاب ہو گئے اور یوں پوری دنیا میں ایٹم بم کے پرامن استعمال کرنے کی مہم شروع کر دی۔ لیکن پڑھے لکھے لوگ اس بات سے پوری طرح واقف تھے کہ ایٹمی قوت کے پرامن استعمال کے پھیلنے سے ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری اور پھیلنے کا خطرہ بھی موجود تھا۔ کیونکہ پرامن استعمال اور ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی میں برائے نام ہی فرق ہے۔ اگر کسی ملک کو ری ایکٹر بنانا اور پلوٹونیم بنانا آجاتا ہے تو پھر ایٹم بم بنانا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کی مسلسل کوششوں اور بعض مغربی ممالک (سویڈن، آئرلینڈ، ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ وغیرہ) کی سنجیدہ انداز فکر نے دنیا کو یہ یقین کرا دیا کہ بین الاقوامی سطح پر ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کی فوری اور اشد ضرورت ہے۔ اس کا نتیجہ مشہور

معاہدہ نیوکلیئر نان پرولیفریشن ٹریٹی NPT یعنی ایٹمی عدم پھیلاؤ کے معاہدہ کی شکل میں نکلا اور ۱۹۷۰ء میں یہ قیام پذیر ہوا۔ ۱۹۸۶ تک تقریباً ایک سو تیس ممالک نے اس معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ حالانکہ اس معاہدے کی نوعیت خاصی امتیازی ہے یعنی جن کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں وہ رکھ سکتے ہیں اور جن کے پاس نہیں ہیں وہ نہ بنائیں گے اور ایٹمی پرامن ٹیکنالوجی کے استعمال پر بھی خاصی پابندیاں ہیں۔ اس معاہدے کے عمل میں آنے سے پہلے چین آخری ملک تھا جس نے ۱۹۶۴ء میں ایٹمی دھماکہ کیا۔ چین کو نہ صرف امریکہ بلکہ روس سے بھی اپنے ملک کی سلامتی اور علاقائی سالمیت کے بارے میں خطرہ تھا۔ حالات بالکل معمول پر تھے اچانک ہندوستان نے امریکہ اور کینیڈا کے مہیا کردہ سامان سے چوری سے پلوٹونیم بنا کر ۱۸ مئی ۱۹۷۴ء کو ایٹمی دھماکہ کر کے دنیا کا ایٹمی توازن درہم برہم کر دیا۔ نہایت افسوس ناک اور قابل مذمت بات یہ تھی کہ چین کے برعکس ہندوستان کو اپنی سلامتی کے بارے میں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا اس نے روس کیساتھ دوستی کا معاہدہ کیا ہوا تھا۔ اس نے کینیڈا کا دیا ہوا ری ایکٹر اور امریکہ کا دیا ہوا ہیوی واٹر استعمال کر کے بم بنایا اور یہ کام چوری سے کیا۔ NPT کو ان اقدام نے ہلا کر رکھ دیا۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو ہماری کہانی کا آغاز اب سنجیدگی سے ہوا۔ ہندوستان کو چوری کی پالیسی کی وجہ سے فوراً کینیڈا نے ہمارے کراچی کے نیوکلیئر پلانٹ کا ایندھن اور ہیوی واٹر روک دیا اور بین الاقوامی معاہدوں کی پرواہ نہ کی۔ ہندوستان کی بدمعاشی کی سزا پاکستان کو دی گئی۔ پاکستان کی منت سماجت کینیڈا کے بند کانوں پر نہ پڑی اور ہم کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔ ہماری مزید بے عزتی کرنے کے لیے فرانس نے بین الاقوامی ایٹمی ادارہ کی زیر نگرانی ری پروسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ منسوخ کر دیا۔ یہ ایک بین الاقوامی معاہدہ تھا اور بین الاقوامی ادارہ نے اس کی منظوری دی تھی۔ امریکہ نے فرانس پر دباؤ ڈال کر یہ کام کرایا اور فرانسیسی جو اپنی خود مختاری کے بھنگڑے ڈالتے تھے امریکہ کے دباؤ میں آ گئے اور معاہدہ توڑ دیا۔ یہ پلانٹ بین الاقوامی ادارہ کی زیر نگرانی تیار ہونا اور چلنا تھا اور اس کے غلط استعمال کی قطعی گنجائش نہ تھی۔ یہی وہ وقت تھا جبکہ ایک تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملک یعنی پاکستان نے یہ چیلنج قبول کیا اور اس میدان میں خود کفیل ہونے کا بیڑا اٹھایا۔ جولائی ۱۹۷۶ء میں ہماری حکومت نے تاریخی فیصلہ کیا کہ ہم یورینیم افزودگی کی ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کریں اور ہمارے ایٹمی ری ایکٹروں کے ایندھن کی دستیابی میں خود کفیل ہو جائیں۔ ۳۱ جولائی ۱۹۷۶ء کو انجینئرنگ ریسرچ لیبارٹری کا قیام عمل میں آیا کہ ہم یورینیم افزودگی کا پلانٹ خود اپنی صلاحیتوں سے لگائیں۔ میں ابھی یورپ میں پندرہ سال کے قیام کے بعد واپس آیا تھا۔ میں نے برلن (جرمنی) ڈیلفٹ (ہالینڈ) اور لیون (بیلجیم) کی اعلیٰ یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ میں نے ہالینڈ میں یورینیم کی افزودگی کے پلانٹ میں کئی سال کام کیا تھا۔ میں جوان تھا، قوت ارادی سے بھرپور تھا، میں نے فزیکل میٹالرجی میں ڈاکٹر آف انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی جو مشکل پروجیکٹس سے کامیابی سے نمٹنے کے لیے موزون ترین تھی۔ مجھے متعلقہ ٹیکنالوجی کا نہایت قیمتی تجربہ تھا اور اس طرح میں اس کام کے لیے موزون ترین شخص تھا۔ میں نے یہ چیلنج کھلے ہاتھوں قبول کیا اور کام شروع کر دیا۔ میں نے پورے ملک سے چند نہایت محنتی، قابل اور محب وطن سائنسدانوں اور انجینئرز کا انتخاب کیا اور ہم اس پروجیکٹ کو جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچانے میں تن من دھن سے لگ گئے۔ جیسا کہ آپ تصور کر سکتے ہیں یہ آسان کام نہ تھا۔ میرے نو منتخب ساتھیوں نے کبھی سینٹری فیوج اور اس کی مدد سے یورینیم کی افزودگی کا نام نہ سنا تھا حالانکہ ان میں سے کئی باہر سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں رکھتے تھے۔

ایک ایسا ملک جو سلائی کی سوئی، اچھی بائیسکل یا اچھی سڑکیں بنانے کے قابل نہ تھا وہ دنیا کی مشکل ترین ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنے چلا تھا۔ نیوکلیئر سائیکل میں یورینیم کی افزودگی کو مشکل ترین سمجھا جاتا ہے۔ میرے رفقاء کار اور میرے لیے یہ ایک بڑا چیلنج تھا۔ پرابلم بالکل واضح تھی، ہم قدرت کے نئے قوانین تلاش نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ ایک بہت ہی پیچیدہ اور مشکل انجینئرنگ پرابلم سے مقابلہ تھا۔ ہمارے لیے یہ ناممکن تھا کہ ہم تمام آلات اور کمپونٹس ملک میں ہی بنائیں۔ اگر ہم یہ راستہ اختیار کرتے تو پروجیکٹ یقیناً بہت جلد موت کی آغوش میں چلا جاتا۔ میں نے یہ طریقہ کار اختیار کیا کہ جو کچھ ہم غیر ممالک سے حاصل کر سکتے تھے وہ ہم نے بذریعہ پی آئی اے منگوایا تا کہ ہم جلد از جلد ایک اچھی بنیاد قائم سکیں۔ بعد میں آہستہ آہستہ ہم نے ہر چیز کہوٹہ میں تیار کرنی شروع کر دی اور کچھ ہی عرصہ میں دنیا کے مشکل ترین آلات بنانا شروع کر دیے تھے۔ یورپ میں میرا طویل قیام، اعلیٰ تعلیم، کئی ممالک سے متعلق معلومات اور ہاں کی اعلیٰ ٹیکنیکل فرموں سے واقفیت میرے لیے ایک بیش قیمت خزینہ تھا۔ دو سال کے اندر ہم نے صحیح کام کرنے والے سینٹری فیوج مشینیں بنالیں اور اپریل ۱۹۷۸ کو کامیابی سے افزودہ یورینیم کے پہلے نمونے حاصل کر لئے۔ ساتھ ہی ہم پوری تندہی سے کہوٹہ کی تعمیر میں مصروف تھے۔ کچھ ناواقف لوگوں نے کہوٹہ کی سائیٹ پر تنقید کی ہے۔ جبکہ غیر متعلقہ اور ناواقف لوگ ہمیشہ دوسرے پہلوؤں پر دھیان دیتے ہیں میری نگاہ میں دو چیزیں بہت اہم تھیں۔ پہلی یہ کہ یہ علاقہ عام آمدرفت اور سیاحوں کی پہنچ سے علیحدہ ہوتا کہ سیکورٹی کا صحیح بندوبست ہو سکے اور دوئم یہ کہ علاقہ دارالحکومت اور بڑے ایئرپورٹ کے نزدیک ہونا ضروری ہے کیونکہ سامان جلد آسکے گا اور حکومتی فیصلہ بغیر تاخیر کے ہو سکیں گے۔ ان دو چیزوں سے بھی زیادہ اہم میرے لیے اپنے رفقاء کار اور انکے اہل وعیال کے لیے سہولتیں (مکانات، تعلیم، طبی سہولتیں، گھر پہ قیام وغیرہ) تھیں جن کی موجودگی میں وہ بے فکری سے دل وجان سے کام کی تکمیل پہنچانے میں مشغول ہو سکتے تھے۔ ہمیں اپنے اس فیصلے پر کبھی بھی افسوس نہیں ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ کے چناؤ اور میرے دارالحکومت میں موجودگی کی وجہ سے ہم نے بہت تیزی سے پروگرام کو آگے چلایا اور تین سال تک مغربی ممالک کو ہمارے کام کے بارے میں ذرا بھی بھنک تک نہ پڑی اور ان کی متحدہ اور مسلسل کوششیں ہمارے پروگرام کو نہ تو سبوتاژ کر سکیں یا روک سکیں۔

تاریخ کہوٹہ۔ پارٹ 2

ہم اس خطرے سے پوری طرح آگاہ تھے اور اس کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ میرا یورپ میں طویل قیام اور وہاں کے لوگوں کی نفسیات کے بارے میں معلومات ایک بیش بہا اثاثہ تھا۔ حکومت ہمیں ہر طرح کی مدد دے رہی تھی اور سب کو ہم پر مکمل اعتماد تھا۔ میں نے بھی پروجیکٹ کی بہتری کی خاطر کوئی اقدام اٹھانے میں قطعی کسی ہچکچاہٹ وخوف کا اظہار نہیں کیا۔ پاکستان پر بہت سخت دباؤ ڈالا گیا۔ امریکہ نے معاشی امداد بند کر دی اور مغربی ممالک نے چھوٹی سی چھوٹی چیزوں مثلاً ربڑ کی اُورنگز تک پر پابندی لگا دی۔ مارجنگ اسٹیل اور مقناطیسی چھلے (Maraing Steel and Magnetic Rings) برآمد نہیں ہونے دیے لیکن ہم نے بہادری سے ان پابندیوں کا مقابلہ کیا اور مصمم ارادہ کر لیا تا کہ جلد از جلد اپنا مقصد حاصل کر لیں۔

جونہی مغربی ممالک کو یہ علم ہو کہ ہم سینٹری فیوج کا طریقہ استعمال کر کے یورینیم کی افزودگی کرنا چاہتے ہیں تو ان کے پریس اور لیڈروں

نے ہمارے خلاف اسرائیل کے دباؤ میں ایک جھوٹا مقدمہ قائم کیا گیا۔ میں نے اپنے دو پرانے ساتھیوں کو خطوط لکھے تھے۔حکومت نے الزام لگایا کہ میں نے ان سے سیکرٹ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے بتائے بغیر مقدمہ چلایا گیا اور سزا سنا دی گئی۔خطوط میں جو معلومات میں نے مانگی تھیں وہ تقریباً بیس سال پہلے رسالوں میں چھپ چکی تھیں۔ ہمارے پاس وہ رسالے نہ تھے۔ میں نے دنیا کے سات مشہور ترین پروفیسروں (ہالینڈ، جرمنی، انگلینڈ، فرانس، بلجیم) سے سرٹیفکیٹ حاصل کرکے عدالت میں پیش کردیے کہ وہ معلومات قطعی حساس نہیں تھیں اور لٹریچر میں موجود تھیں۔ایمسٹرڈم کی ہائی کورٹ نے میرا موقف قبول کرکے اس سزا کو منسوخ کرکے کیس ختم کردیا۔میری جانب سے ہمارے مشہور قانون دان جناب ایس ایم ظفر نے ایک ڈچ وکیل کے ساتھ بہترین پیروی کی۔ 16 جون 1985ء کو ڈچ حکومت نے میرے خلاف تمام الزامات واپس لے لئے اور پراسیکیوٹر جنرل نے تحریری طور پر ہمیں مطلع کیا کہ ان کو میرے اوپر کبھی بھی کسی قسم کی جاسوسی یا چوری کا شک وشبہ نہ تھا اور یہ مقدمہ دائر کرنا حکومت کے اہل کاروں کی غلطی تھی۔

یورینیم افزودگی۔جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں یورینیم کی افزودگی نیوکلیئر سائیکل میں سب سے مشکل ترین کام یا مرحلہ ہے۔سینٹری فیوج ٹیکنالوجی، میکانیکل انجینئرنگ، کیمیکل انجینئرنگ، الیکٹریکل، پروسیس ٹیکنالوجی، کمپیوٹر سافٹ ویئر (کنٹرول اور آٹومیشن)، نیوکلیئر فزکس، ویکیوم ٹیکنالوجی وغیرہ جیسے علوم میں بہت مہارت کی ضرورت ہے۔ایک سینٹری فیوج مشین تقریباً ستر ہزار چکر فی منٹ کرتی ہے (70,000PM) اور آپ خود تصور کرسکتے ہیں کہ اس کے لیے تمام دھاتوں، پرزوں، توازن، بیرنگ وغیرہ پر بہت ہی سخت شرائط کا اطلاق ہوتا ہے اور پھر ہزاروں سینٹری فیوج بیک وقت چلتی ہیں اور یہ عموماً دس سال تک بغیر رکے دن رات چلتی رہتی ہیں۔مغربی ممالک یقیناً ان رازوں سے واقف تھے اور انہیں پورا یقین تھا کہ پاکستان جیسا پسماندہ ملک کبھی بھی اس کام میں مہارت حاصل نہ کرسکے گا۔ہم نے ان کو غلط ثابت کردیا۔ہم نے صرف اس ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرلی بلکہ ایک نہایت اعلیٰ پلانٹ لگا کر یہ ثابت کردیا کہ ہم ایک غیور اور لائق قوم ہیں۔جب ہم لندن کی ایمرسن کمپنی سے سینٹری فیوجز کو چلانے والے انورٹرس (پاور سپلائرز) خریدے تو ہم نے دیکھا کہ ان میں بہتری کی کافی گنجائش تھی۔ہم نے کمپنی کو اس کی تجاویز بھیج دیں اور طریقہ کار بھی بتلا دیا۔بعد میں بی بی سی کی شرانگیز اور پروپیگنڈا پر مبنی فلم پروجیکٹ 706، دی اسلامک بم (Project 706- the Islamic Bomb) میں کہا گیا کہ ہمارے بہتری کی تجاویز نے ان کے ہوش اُڑا دیے۔

اس دوران ہمیں لاتعداد مغربی فرموں نے خطوط اور ٹیلکس روانہ کئے جن میں ان تمام آلات وسامان کی فہرست تھی جو انہوں نے ہالینڈ، جرمنی اور انگلینڈ کو فروخت کی تھیں۔ وہ ہمارے پیچھے دوڑ رہے تھے کہ ہم ان سے سامان خرید لیں۔ہم نے اپنی ضروریات کا سامان خرید لیا اور جہاں ضرورت پڑی اپنی خواہش کے مطابق تبدیلیاں بھی کرالیں۔ جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے یہ عام کیمیکل اور ویکیوم پلانٹس میں استعمال ہونے والی تھیں مگر نیوکلیئر پلانٹ میں بھی استعمال ہوسکتی تھیں اور ان کی ایکسپورٹ میں ان فرموں کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

اس مجبوری کے باوجود کہ ہم غیر ملکی ماہرین سے کھل کر تبادلہ خیال نہیں کرسکتے تھے ہم نے پھر بھی تمام پرابلمز کو بیک وقت کامیابی سے حل کیا۔میرے قابل رفقائے کار نے نہ صرف نہایت اعلیٰ کارکردگی والی سینٹری فیوج مشینیں بنائیں بلکہ پلانٹ کا مشکل ترین ڈیزائن بھی تیار کیا مشینوں

کو قطار میں لگانے کا طریقہ کار ڈیزائن کیا، تمام پائپنگ سسٹم لگایا، ہزاروں میل لمبائی کے ایلومینیم پائپ ویلڈ کیے اور پلانٹ کو کمپیوٹر سافٹ ویئر اور ہارڈ ویئر کی مدد سے مکمل آٹومیٹک کنٹرول مہیا کیا۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ ریڈیو ایکٹیوٹی کی وجہ سے ایک نیوکلیئر یا یورینیم کی افزودگی کے پلانٹ کو چلانے کے لیے بہت ہی اہم اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ ہم نے سب خود ڈیزائن کیے۔ ہم نے مشینوں میں ہیکسا فلورائیڈ گیس بھیجنے اور افزودگی کے بعد اس کو نکالنے کا بندوبست کیا۔ جب مغربی ممالک نے ہر قسم کے سامان کی برآمدگی پر پابندیاں لگا دی تو ہم نے تمام اہم مشکل ترین الیکٹرانک، ویکیوم اور الیکٹریکل آلات خود بنانا شروع کر دیے۔

کھوٹہ مکمل طور پر پاکستانی کاوشوں کا پھل ہے اور یہ ایک غریب اور ترقی پذیر ملک کے اس مصمم ارادوں کی عکاسی کرتا ہے جو اس نے غیر ملکی دباؤ اور بلیک میلنگ کو مسترد کرنے کے لیے کیا تھا۔ یہ نہ صرف میرے لیے باعث فخر و تسکین کی بات ہے بلکہ میرے رفقاء کار اور پوری قوم کے لیے باعث فخر ہے۔

کسی بھی پلانٹ کو لگانے کے لیے کئی اقدامات کرنا پڑتے ہیں مثلاً تصور، فیصلہ، اس کے کامیابی کے امکانات پر غور، بنیادی تحقیق، ٹیبل ماڈل، پائلٹ یعنی تجرباتی چھوٹا پلانٹ، بڑے پلانٹ کی مکمل انجینئرنگ اور آخر میں اس کی تعمیر۔ ان اقدامات پر عمل کرنے میں بہت وقت درکار ہوتا ہے خاص طور پر جبکہ ٹیکنالوجی بہت ہی پیچیدہ اور مشکل ہو۔ میرے رفقاء کار اور میں نے نہایت دلیری سے تمام اقدامات بیک وقت شروع کر دیے چونکہ ہمیں اللہ تعالیٰ پر اور اپنی صلاحیتوں پر مکمل بھروسہ تھا۔

ابھی پنڈی کے بوسیدہ علاقہ میں بنیادی کام جاری تھا اور غیر ملکیوں سے تمام ضروری اور اہم سامان خریدا جا رہا تھا کہ ہم پہلی سینٹری فیوج مشینیں بنا رہے تھے، سہالہ میں پائلٹ پلانٹ لگا رہے تھے اور کھوٹہ میں بڑے پلانٹ کی تعمیر کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ یہ ایک نہایت دلیرانہ اور انقلابی اقدام تھا۔ ہمیں اس پر افسوس نہیں ہوا اور دراصل اسی طریقہ کار کی وجہ سے ہماری کامیابی اس قدر کم عرصہ میں یقینی ہوگئی۔

کسی بھی مشکل اور پیچیدہ پروجیکٹ میں مشکلات بھی پیش آتی ہیں اور اکثر انسان اپنی زندگی میں کامیابی نہیں دیکھ پاتا لیکن ان مشکلات کی کوئی اہمیت نہیں اگر آپ نیک نیتی اور مصمم ارادہ سے اپنے کام میں لگے رہیں۔ میرے رفقاء کار اور میں اپنے کام میں نہایت سنجیدہ تھے۔ ہماری نگاہ میں یہ پاکستان کی بقاء موت کا معاملہ تھا اور اللہ تعالیٰ کے کرم اور ہماری سخت محنت و کاوش سے ہم نے یہ کامیابی اپنی زندگی میں ہی دیکھ لی اور اپنے ملک کو ناقابل تسخیر وفاع مہیا کر دیا۔

ہمارے صدر محترم، وزیراعظم اور قومی لیڈروں نے بار بار ہمارے ایٹمی پروگرام کے پرامن ہونے کا اعادہ کیا ہے۔ 1985ء کے آواخر میں مرحوم جنرل ضیاء الحق نے اقوام متحدہ میں مندرجہ ذیل پانچ نکات ہندوستان کو پیش کیے مگر ہندوستان نے وہ قبول نہیں کیے۔

1۔ جنوبی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دے دیں۔

2۔ NPT پر دونوں ممالک بیک وقت دستخط کر دیں۔

3۔ دونوں ممالک آپس میں ایٹمی عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط کریں۔

4 ۔ بین الاقوامی معائنہ ٹیمیں دونوں ممالک کی ایٹمی تنصیبات کا معائنہ کریں۔

5 ۔ دونوں ممالک ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری اور استعمال نہ کرنے کا معاہدہ کرلیں۔

اگرچہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ایٹمی پروگرام جاری رکھنے میں اور خود کو مغربی ممالک کے دباؤ اور بلیک میلنگ کو مسترد کرنے میں حق بجانب ہیں پھر بھی دونوں ممالک کے کروڑوں غریب عوام کی خاطر یہ عقلمندانہ قدم ہوگا کہ آپس میں اعتماد قائم کیا جائے، شک وشبہ دور کیا جائے اور ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ سے گریز کیا جائے اور یہ تمام رقم عوام کی تعلیم اور فلاح وبہبود پر خرچ کی جائے۔

پاکستان کے یورینیم کی افزودگی کے کامیاب پروگرام نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اگر ایک قوم عزم اور سنجیدگی سے کوئی ہدف حاصل کرنا چاہے تو وہ توقع سے پہلے یہ حاصل کرسکتی ہے۔ جو کچھ ہم نے سات سالوں میں نہایت خطیر رقم خرچ کر کے حاصل کیا وہ دوسروں کی نگاہ میں پچاس سال میں بھی حاصل کرنا ناممکن تھا۔ اپنے مقصد کے لیے پرعزم کوشش یقیناً پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کو ایٹمی ری ایکٹر بنانے میں کامیابی سے ہمکنار کرسکتا ہے ابھی وقت نہیں گیا۔ پاکستان اب بھی دنیا کو یہ ثابت کرسکتا ہے۔ کہ وہ قومی مفاد اور عزت کے لیے ہر چیلنج قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یورینیم کی افزودگی کا کام ہمارے لئے یقیناً بہت بڑا چیلنج تھا۔ بہت دشوار تھا، مہم جو اور دلیرانہ تھا لیکن نہایت ہی باعث سکونِ قلب اور مسرور کن تھا۔ میرے رفقاء کار اور میں اس پر فخر کرتے ہیں۔ کہ ہم نے اپنے ملک کی سائنٹیفک اور ٹیکنکل میدان میں ترقی کے لیے اس اہم ٹیکنالوجی میں اس کو خودکفیل کردیا۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ ایک نہایت شکرگزار اور احسان مند قوم ہمیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔ اور ہمارے کارنامے آئندہ نسل کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گے۔ (پاکستان زندہ باد)

کہوٹہ پراجیکٹ کے دنوں ڈاکٹر خان کے معمولات

محسن پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کے دنوں میں ایک غیر معروف علاقہ میں اپنے دفتر میں پہنچ جاتے تھے۔ ان کی گاڑی کے آگے پیچھے سیکورٹی کا ایسا زبردست انتظام ہوتا کہ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ وہاں پر آپ تقریباً ایک گھنٹہ کام کرتے۔ ان کے ساتھی جو اسی دفتر کی عمارت میں کام کرتے تھے۔ ان کے سربراہان کو ضروری ہدایات دیتے اگر ضرورت ہوتی متعلقہ حکومتی عہدیداروں اور جی ایچ کیو میں فون پر گفتگو کرتے۔ اور پھر کے آر ایل تشریف لے جاتے کے آر ایل سے انکا دفتر چالیس اور گھر سے پچاس کلومیٹر دور ہے یعنی ڈاکٹر روزانہ گھر سے دفتر اور دفتر سے کے آر ایل واپسی پر کے آر ایل سے گھر تک ایک سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتے۔ اور چھٹی والے دن جب انہیں دفتر جانا نہ ہوتا تو اسلام آباد کے سیکٹر ای سیون میں واقع اپنے گھر سے ملحقہ مہمان خانے میں اپنے ان غیر ملکی مہمانوں سے ملتے جن کے ذریعے کہوٹہ پروگرام کو آگے بڑھانے میں مدد ملتی تھی۔ ڈاکٹر خان دراصل کے آر ایل کے لیے تمام مال اپنے دوستوں کی وساطت سے ہی منگوا رہے تھے۔ جو انہوں نے یورپ میں اسی وقت سے بنانے شروع کردیے تھے۔ جب سے وہ وزیراعظم بھٹو سے ملاقات کرکے واپس گئے تھے۔ کیونکہ انہیں اندازہ تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر خان نے اپنی

خداداد صلاحیتوں سے اپنے ان غیر ملکی دوستوں سے ملنے کے لیے بھی اپنے گھر کو منتخب کیا تھا کیونکہ وہ کہوٹہ اور اپنے دفتر کو ہر کسی کی نظروں سے اوجھل رکھنا چاہتے تھے۔ اور ان کی اپنے کام سے لگن کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ انہوں نے اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے بھی چھٹی کے دن کو منتخب کیا تھا۔ حالانکہ وہ صرف ایک دن اپنے گھر والوں کو دے سکتے تھے لیکن اسے بھی انہوں نے وطن عزیز کے ایٹمی پروگرام پر قربان کر دیا تھا۔ تو جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ دفتر میں ایک گھنٹہ کام کرنے کے بعد آپ کے آر ایل کی طرف روانہ ہو جاتے۔ بعض اوقات ڈاکٹر خان اپنے کسی ایسے رفیق کار کو اپنے ہمراہ کہوٹہ لے جاتے جن کے ساتھ وہ دوران سفر تفصیل سے بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کے آر ایل میں سیکورٹی اور احتیاط کا ایک ایسا زبردست اور لاثانی نظام ہے۔ کہ ڈاکٹر خان کے ساتھ کے آر ایل جانے والے رفیق کار بھی پروجیکٹ کے اندر ایک خاص حد تک ہی جا پاتے تھے۔ پراجیکٹ میں آپ مختلف شعبوں کا معائنہ کرتے اور انجینئرز سے تبادلہ خیال کرتے۔ انکے مسائل اور مشکلات سے آگاہی حاصل کر کے ضروری ہدایات جاری کرتے۔ بعض اوقات وہ کسی ورکشاپ میں اپنے کام میں مگن کسی عام کارکن کے پاس جا کر بھی کھڑے ہو جاتے اور اسے تھپکی دیتے۔ اور اگر کسی عام کارکن کے کام سے بھی متاثر ہوتے تو اسے آگے بڑھ کر گلے لگا لیتے اور شاباشی دیتے۔ دوپہر کا کھانا وہ عام طور پر کے آر ایل میں ہی کھاتے اور کھانا میں بھی مختلف شعبہ جات کے ڈائریکٹرز کو شامل کرتے۔ آپ نے کھانا کبھی بھی تنہا نہیں کھایا۔ ڈاکٹر خان کے ایک قریبی رفیق کار نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر خان ایک زبردست ماہر نفسیات بھی ہیں۔ کھانے کی میز پر وہ اپنے رفقاء کار کی غیر رسمی باتوں کے علاوہ ان کی غیر ارادی حرکات وسکنات سے بھی بہت نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔

اڑھائی تین بجے سیکورٹی کی گاڑیاں حرکت میں آتیں اور یوں واپسی کے لیے قافلہ چل پڑتا۔ اور پھر واپسی پر بھی وہ دفتر میں ایک گھنٹہ گذارتے۔ ڈاکٹر خان کے ایک سٹاف افسر کے مطابق بارش ہو یا طوفان ڈاکٹر خان کے آر ایل ضرور جاتے اور وہاں کے ہر شعبہ کی ذاتی طور پر دیکھ بھال کرتے تھے۔ موسم گرما ہو یا سرما رات کا کھانا وہ ٹھیک سات بجے کھا لیتے ہیں۔ یوں صبح سات بجے سے شام سات بجے تک وہ کام، کام اور صرف کام کرتے رہتے۔

تاہم جب میزائل پروگرام تیزی سے آگے بڑھنے لگا اور ڈاکٹر خان کا خواب حقیقت دھارنے لگا تو ان کے اوقات کار میں مذید اضافہ ہونے لگا۔ اور وہ مجموعی طور پر روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنے لگتے اور جب ایک مرتبہ غوری پروجیکٹ کے سرد خانے میں چلے جانے کا خطرہ پیدا ہونے لگا اور ڈاکٹر خان وسوسوں کا شکار ہونے لگے تو روزانہ ان کے بیس سے بائیس گھنٹے غوری کی نذر ہونے لگے اور ان کی نیندیں حرام ہونے لگیں۔ اور یوں مسلسل کام کرتے رہنے کی وجہ سے جنوری، فروری 1998 میں محسن پاکستان اپنے بدن میں تھکاوٹ کی شکایت کرنے لگے۔ ایک مرتبہ جناب زاہد ملک سے انہوں نے کمر اور ریڑھ کی ہڈی میں ہلکی سی درد کا بھی ذکر کیا۔ زاہد ملک نے ان کی ہمت بڑھانے کیلئے کہا کہ دیکھنے میں تو آپ الحمدللہ بہت فٹ نظر آتے ہیں۔ آپ کے چہرے سے تھکاوٹ یا کمزوری وغیرہ کا معمولی سا بھی احساس نہیں ہوتا۔ اس پر محسن پاکستان نے ملک صاحب سے ایک تاریخی فقرہ بولا "ملک صاحب! میں واقعی تھک گیا ہوں لیکن میری تھکاوٹ اس دن خود بخود ختم ہو جائے گی جس دن غوری فضاء میں بلند ہوگا"

قارئین اندازہ لگایئے کہ محسن پاکستان نے پوری قوم کو چین کی نیند سلانے کے لئے کس طرح اپنے آپ کو بھی روگ لگا لیا اور اس کا حل بھی اگر تجویز کیا تو وہ یہی تھا کہ پاکستان ناقابل تسخیر بن جائے۔ ڈاکٹر خان کے روزانہ کے معمولات میں ان کے جس مہمان خانے کا ذکر کیا گیا اس کے

بارے میں کہوٹہ دشمن لابی کے "مہربانوں" نے دنیا بھر میں پراپیگنڈا کیا کہ وہاں وہ غیر ملکیوں کے ساتھ شراب نوشی کرتے ہیں۔ یہاں میں پوری قوم اور بالخصوص نوجوان طبقہ سے اس بات کی گذارش کروں گا کہ وہ اپنے کردار کو محسن پاکستان کے کردار کی طرح بنائیں اور یہ ہماری خوش قسمتی ہیں کہ ہم نے محسن پاکستان کا دور پایا ہے۔ یہ تھے ڈاکٹر خان کے کہوٹہ کے دنوں کے مختصر معمولات! جن کا تفصیل سے ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ یہ بھی ایک قومی راز ہے جو رازہی رہے تو بہتر ہے۔

پاکستان عالمی سازش کے نرغے میں

طارق اسماعیل ساگر کے چشم کشا مضامین کا مجموعہ...... جن میں پاکستان کو لاحق تمام اندرونی و بیرونی خطرات و سازشوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ 4 اگست 2009 کے موقع پر، پاکستانی نوجوانوں کو باشعور کرنے کی کتاب گھر کی ایک خصوصی کاوش...... درج ذیل مضامین اس کتاب میں شامل ہیں: پاکستان پر دہشت گردوں کا حملہ، 20 ستمبر پاکستان کا نائن الیون بن گیا، دھماکے، وطن کی فکر کر ناداں!، پاکستان عالمی سازش کے نرغے میں، حکمتِ عملی یا سازش، طالبان آ رہے ہیں؟، محلاتی سازشوں کے شکار، ابھی تو آغاز ہوا ہے!، بلیک واٹر آرمی، اکتوبر سرپرائز اور "کشمیری دہشت گرد"، سازشی متحرک ہو گئے ہیں!، وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے!، پاکستان کے خلاف "گریٹ گیم"، جمیت نام تھا جس کا......، آئی ایم ایف کا پھندہ اور لائن آف کامرس، آئی ایس آئی اور ہمارے اربابِ اختیار، ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا اغواء، کمانڈو جرنیل بالآخر عوام کے غضب کا شکار ہو گیا، انجامِ گلستاں کیا ہو گا؟، خون آشام بھیڑیے اور بے چارے پاکستانی، عالمی مالیاتی ادارے، چلئے تو کٹ ہی جائے گا سفر!APDM، سکے جمع کرنے کا شوق، اب کیا ہو گا؟، الیکشن 2008ء اور تلخ زمینی حقائق، کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟، آمریت نے پاکستان کو کیا دیا، ہم کس کا "کھیل" کھیل رہے ہیں! نئی روایات قائم کیجئے، نیا پنڈورا باکس کھل رہا ہے، قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند!، خوراک کا قحط!، 10 جون سے پہلے کچھ بھی ممکن ہے؟، پہنا گئی درویش کو تاجِ سرِ دارا، کالا باغ ڈیم منصوبے کا خاتمہ، بے نظیر کا خون کب رنگ لائے گا؟، صدر کا مواخذہ، صدر کو اہم مسائل کا سامنا ہے، جناب صدر! پاکستانیوں پر بھی اعتماد کیجئے!، نیا صدر...... نئے چیلنج اور سازشیں، 23 مارچ کا جذبہ کہاں گیا؟، امریکہ، امریکہ کی عسکری اور بھارت کی آبی جارحیت، امریکی عزائم اور ہماری بے بسی، پاکستانی اقتدار اعلیٰ کا احترام کیجئے!، امریکہ کی بڑھتی جارحیت، ہماری آنکھیں کب کھلیں گی؟، وقتِ دعا ہے!، امریکی جارحیت کا تسلسل، جارحانہ امریکی یلغار اور بھارتی مداخلت، وزیراعظم کے دورے، عالمی منظر نامہ بدل رہا ہے، باراک اوباما، ممبئی لرز اٹھا، بھارت خود کو امریکہ سمجھ رہا ہے، بھارت سے ہوشیار، مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی نئی لہر

اس کتاب کو پاکستان کی تاریخ اور حالات حاضرہ سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

باب سوم

جذبہ حب الوطنی کی دلربا داستان

1۔ وائے افسوس

2۔ پیکرِ وفا محترمہ ہنی خان کا انٹرویو

3۔ اداروں کا کردار

4۔ پراجیکٹ ڈائریکٹر یا ورکر

5۔ کے آر ایل کا کریڈٹ

جذبہ حب الوطنی کی دلربا داستان

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے محسن پاکستان کے آر ایل کے دنوں میں اٹھارہ سے بیس گھنٹے تک مسلسل کام کرتے رہے ہیں اور اس کے پیچھے صرف اور صرف ایک جذبہ کارفرما تھا اور وہ تھا جذبہ حب الوطنی! جی ہاں! وطن سے محبت ایک ایسا جذبہ ہے کہ جو اگر کسی انسان میں پیدا ہو جائے تو اسکے لئے کوئی کام بھی مشکل نہیں رہتا۔ ڈاکٹر خان سے ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب آپ نے اور آپکی ٹیم نے یہ سب کچھ کیسے کرلیا۔ ایک ملک جو ابھی تک ایک سوئی تک بنانے کے قابل نہیں ہوا آخر اس نے دنیا کا سب سے بہترین صلاحیت کا حامل ایٹم بم کیسے تیار کرلیا؟ اس سوال کے جواب میں محسن پاکستان نے ایک تاریخی فقرہ فرمایا کہ ''جب جذبہ جنوں بن جائے تو ستاروں پر کمند ڈالنا کچھ مشکل نہیں ہوتا''

قارئین کرام! جیسا کہ آپ نے ڈاکٹر خان کے مضامین میں بھی پڑھا کہ یہ عظیم کارنامہ ان کے ساتھیوں کی محنتوں کی وجہ سے ہی سرانجام پایا ہے۔ کہوٹہ کے کام کو ہنگامی بنیادوں پر مکمل کرنے کے لئے ڈاکٹر خان نے آرمی کور آف انجینئرنگ کی ایک ٹیم حاصل کی تھی جسکا ایک فائدہ تو یہ تھا کہ فوج میں ڈسپلن بھی ہوتا ہے اور ویسے بھی یہ محنتی لوگ تھے۔ دوسرے آرمی سے تعلق کی وجہ سے ان میں کرپشن کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اور اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کے آر ایل کی تکمیل تک کسی کو اسکا علم بھی نہ ہوسکا تھا۔ اور تین سال تک کسی کو کہوٹہ پلانٹ کی بھنک بھی نہ پڑسکی اور حیرت کی بات ہے کہ 1979 کے وسط تک کسی کو شائبہ بھی نہ تھا کہ کہوٹہ میں کچھ ہورہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی جو میں نے ابھی عرض کی کہ اس علاقے میں تمام فوجی ہی رہتے تھے جو مختلف بھیس بدلے ہوئے تھے۔ کہوٹہ کی سیکورٹی کا پلان ایسا منفرد تھا کہ آج تک اس پر پوری دنیا دنگ ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلتی کیڑی (چیونٹی) تک کو دیکھنے کا دعویٰ کرنے والی سی آئی اے کو یہ تک پتہ نہیں کہ ہمارا ایٹم بم کہاں پڑا ہوا ہے۔ اسے میں اللہ کی ذات کے بعد سٹریٹیجک پلاننگ ڈویژن (ایٹمی اثاثوں کی سیکورٹی پر مامور کمیٹی) کے جذبہ حب الوطنی کا نام دوں گا۔

وفاقی دارلحکومت کی قربت کا بھی کہوٹہ پروجیکٹ کی تیزی سے تکمیل میں بہت اہم کردار ہے۔

اس عظیم اور تاریخی پراجیکٹ کا آغاز انتہائی نامساعد حالات میں ہوا جس کا اندازہ ڈاکٹر خان کے ایک انتہائی قریبی ساتھی (ڈاکٹر نذیر احمد بھی پرویز مشرف کے عتاب کا شکار ہوئے) ڈاکٹر نذیر احمد نے مجھے بتایا کہ اس منصوبے کے ابتدائی دفاتر اسلام آباد ایئرپورٹ کے پرانے رن وے کے ساتھ ہی فضائیہ کے ان گیراج میں قائم ہوئے جو انتہائی بوسیدہ تھے۔ ان میں چمگادڑوں، بچھوؤں اور دیگر حشرات الارض کے ڈیرے تھے اور معمولی سی بارش میں بھی یہ بری طرح ٹپکنے لگتے تھے۔ جب انکی مرمت اور صفائی کا کام شروع ہوا تو کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ جب ایک دو سانپ نہ نکلے ہوں۔ ان دنوں یہ پراجیکٹ ایٹمی توانائی کمیشن سے منسلک تھا۔ اور منیر احمد خان نگران اعلیٰ تھے۔ لیکن یوں لگتا تھا کہ جیسے انہیں اس کام سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ عملہ کے بیس ارکان میں سے آٹھ دس فوج سے لئے گئے تھے۔ کمیشن والوں کے پاس گاڑیوں کا ایک پورا فلیٹ تھا۔ لیکن اس

پروجیکٹ پر کام کرنے والے سائنسدانوں کو ایک پرانی سی پک اپ اور ایک انتہائی خستہ سی ویگن دی گئی تھی۔ ہم سب لوگ اسی میں آتے جاتے تھے۔ کام انتہائی ست روی اور بے ترتیبی سے جاری تھا۔ یوں محسوس ہوتا کہ جیسے ہم لوگ صرف ٹائم پاس کرنے کے لئے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی مقصد نہ تھا۔ ہمارا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہمارے نگران کے پاس قیادت کا فقدان تھا۔ لیکن انتہائی حیرت انگیز بات ہے کہ جب جولائی 1976 میں ڈاکٹر خان کو نگران اعلیٰ بنایا گیا تو جیسے ایک انقلاب سا آ گیا۔ جس کے بعد ہم پہلی مرتبہ یہ محسوس کرنے لگے کہ ہم جس کام سے وابستہ ہیں وہ انتہائی اہم ہے۔ اور ایک قومی مشن کا درجہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر خان میں ماشاءاللہ قیادت کی خوبیاں اللہ نے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ آپ یقین کریں کہ ہم لوگ جو محسوس کر رہے تھے کہ ہم ٹائم پاس کرنے آتے ہیں۔ چند ہی دنوں میں ہم تمام ساتھیوں میں ایک نیا جذبہ اور نیا ولولہ پیدا ہو چکا تھا۔ جس کمرے میں یہ لیبارٹری قائم تھی وہاں سے تقریباً ہر روز کوئی نہ کوئی سانپ نکل آتا اور اسے مار دیا جاتا۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ ڈاکٹر خان کی مستعدی کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ انہوں نے فوری طور پر لیبارٹریز کے لئے سامان منگوالیا اور نیا عملہ بھرتی کرنے لگے تا کہ کام کو تیز کیا جا سکے۔"

ڈاکٹر نذیر احمد نے مزید بتایا کہ "جب پہلی سینٹری فیوج تیاری کا عمل شروع ہوا تو ڈاکٹر خان اس کے ساتھ ہی سہالہ میں تجرباتی پلانٹ کی تفصیلات طے کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ڈاکٹر خان کا طریقہ انتہائی منفرد اور اچھوتا تھا۔ ہم میں سے اکثر اس ٹیکنالوجی سے بھی نابلد تھے۔ جبکہ بیشتر نے سینٹری فیوج کا نام بھی پہلی مرتبہ سنا تھا۔ جسکی وجہ سے ان سے کئی مرتبہ نقصان بھی ہوا۔ لیکن ڈاکٹر خان کے ماتھے پر کبھی کوئی شکن تک نہیں آئی۔ بلکہ ہمیشہ انہوں نے ہمارے اندر ایک نیا حوصلہ اور ولولہ پیدا کیا ہے۔ ان کی اس کام سے لگن کا اندازہ اس کام سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بعض اوقات ایک عام ٹیکنیشن کے کام کو دیکھنے کے لئے گھنٹوں اس کے ساتھ کھڑے رہتے اگر اس دوران اس سے کوئی غلطی ہو جاتی تو مسکراتے ہوئے اس سے کہتے کہ ایسے نہیں ایسے اور یوں اسکی اصلاح فرما دیتے۔

قارئین کرام! یہی وہ دلربا داستان ہے کہ جس کی وجہ سے آج ہم اس مقام پر کھڑے ہیں کہ پوری دنیا اور بالخصوص اپنے ازلی و ابدی دشمن بھارت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے ہیں۔

یاد رکھیے جب آپ اپنی شخصیت، مقام، مرتبے اور انا پر قومی مفاد کو ترجیح دیں گے۔ تو یقیناً آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ کس طرح ڈاکٹر خان نے اپنے کارکنوں کے ساتھ کارکن بن کر انکی ہمت بڑھائی اور ان کے ساتھ بے تکلفانہ ماحول میں کام کیا ان عظیم ہستیوں (ڈاکٹر خان اور ان کی ٹیم) کی قدر و منزلت کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ اکثر اوقات جب رات گئے تک کام جاری رہتا تو ڈاکٹر خان اور ان کے ساتھی کے آر ایل میں ہی فرش پر دریاں بچھا کر سو جاتے۔

وائے افسوس

کہوٹہ دشمن لابی نے ڈاکٹر خان اور ان کے ساتھیوں پر الزامات عائد کیے ہیں کہ کہوٹہ کا کوئی آڈٹ نہیں ہوتا تھا۔ وہاں پانی کی طرح پیسہ بہایا گیا ہے۔ ان سے یہ عرض ہے کہ جو لوگ ان حالات میں جواو پر ذکر کیے گئے ہیں۔ کام کرتے تھے کیا انہیں اتنی بھی نہ سوجھی کہ وہ اپنے آرام کے لئے ایک عام سا بیڈ روم ہی بنالیں۔ حالانکہ خود الزام عائد کرنے والوں کی حالت یہ تھی کہ ان کے ہر دفتر کیساتھ ایک وی آئی پی بیڈ روم اور باتھ روم

ملحق ہوتا تھا۔قوم کا پیسہ تو ان لوگوں نے بہایا ہے کہ جنہوں نے آج تک قوم سے دعوے تو کیئے ہیں لیکن کام خاک بھی نہیں دکھلایا۔اگر ان میں اتنی ہی قابلیت ہے تو یہ پاکستان کی بجلی کی ضروریات کو تو پورا کر کے دکھائیں۔ یہ پاکستان کے اہم عہدوں پر اسی لئے قابض ہیں کہ وطن عزیز کو پانی و بجلی اور دیگر معاملات میں خود کفیل نہ ہونے دیں۔میں یہ سب باتیں جذبائیت کے ساتھ نہیں بلکہ دردِ دل سے کر رہا ہوں۔

پیکرِ وفا محترمہ ہینی خان کا انٹرویو

قارئین کرام! کہتے ہیں کہ ہر کامیاب آدمی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ بات کہاں تک درست ہے میں اس بحث میں پڑھنے کی بجائے صرف یہی عرض کروں گا کہ ڈاکٹر خان کو کے آر ایل کے معاملات میں کبھی بھی ان کی اہلیہ محترمہ نے کوئی پریشانی نہیں آنے دی جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان تشریف لاتے ہی ڈاکٹر خان تو جیسے کے آر ایل ہی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ان کی دونوں بچیاں عائشہ اور دینا خان کئی دنوں تک اپنے عظیم باپ کی جھلک تک نہ دیکھ پاتیں۔ ہوتا یوں کہ ڈاکٹر خان جب رات گئے کہوٹہ کے معاملات سے فارغ ہو کر گھر جا کر انہیں بوسہ دیتے اور صبح جب چار بجے نکلتے تو ہماری ان عظیم المرتبت بہنوں کو بستر نیند پر ہی چھوڑ آتے (یہ کہوٹہ کے آخری مراحل کی بات ہے) اور اپنی اہلیہ کے لئے بھی ان کے پاس یہی وقت ہوتا تھا۔لیکن قربان جائیں انکی اہلیہ محترمہ ہینی خان پر کہ جنہوں نے ان سے کبھی زبان پر حرف شکایت نہ لایا۔ بلکہ انہوں نے بھی ہمارے ایٹمی پروگرام کے لئے ڈاکٹر خان پر اپنے اور اپنی بچیوں کے حقوق کی قربانی دے دی۔

قارئین! ڈاکٹر خان کی شخصیت کے تو ایک ایک پہلو سے وطن پرستی عیاں ہوتی ہے نجانے ہماری حکومت کیوں اتنی بھیگی بلی بن گئی ہے کہ ان پر لگائے الزامات کی تردید کیوں نہیں کرتی۔لیکن میرا ایمان ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ سب کچھ سورج کی روشنی کی مانند واضح ہو جائے گا۔ان شاءاللہ

محترم قارئین! ذیل میں ہم صدق و وفا کی پیکر مجسم اور ہماری مشرقی عورتوں کے لئے نمونہ بن جانے والی اس عظیم خاتون مس ہینی خان کا انٹرویو پیش خدمت کرتے ہیں جو انہوں نے کہوٹہ پراجیکٹ کے دنوں میں دیا تھا۔ کہ جب ابھی ایٹم بم نہیں بنا تھا۔اس انٹرویو سے ڈاکٹر خان کی گھریلو زندگی کے چند پہلوں سمیت، آپ کہوٹہ سے ان کی غیر معمولی وابستگی سے بھی آگاہ ہوں گے۔ یہ انٹرویو پڑھ کر کہوٹہ دشمن لابی کو بھی چاہیئے کہ وہ ہوش کے ناخن لے۔

انٹرویو

س: ہمیں اپنے والدین، بہن بھائیوں اور دیگر اہل خانہ کے بارے میں بتایئے؟

ج: میرے والدین اصلاً ڈچ ہیں جنہوں نے میری پیدائش کے بعد یورپ میں دوسری جنگ عظیم سے بچنے کے لئے جنوبی افریقہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ جنگ کے دوران میرے والد نے جنوبی افریقہ کی فوج میں ملکی دفاع کے لئے خدمات انجام دیں. بعد میں وہ شمالی رہوڈیشیا کی طرف چلے گئے (جواب زمبیا کہلاتا ہے) کیونکہ میرے والدین کو وہ حسن سلوک پسند نہ تھا جو مقامی آبادی سے روا رکھا جاتا تھا۔ میرے والد کی تعمیراتی کمپنی تھی جس میں میری والدہ ایک متحرک حصہ دار تھیں۔ میرا ایک بھائی ہے جو مجھ سے چند سال بڑا ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ ایک ماہر تعمیرات ہے جو ایک بار پھر دنیا کے دوسرے خطے میں یعنی امریکہ میں ترک وطن کر گیا اب افریقہ میں ہمارا کوئی رشتہ

دار نہیں لیکن آسٹریلیا اور اسکے نزدیک واقع تسمانیہ میں میرے بے شمار عم زاد موجود ہیں۔ ہالینڈ میں میرے بے شمار رشتہ دار ہیں لیکن ان میں سے اکثر دور کے ہیں البتہ قریبی رشتہ داروں میں ایک سگی خالہ موجود ہیں۔

س: آپ نے اپنا بچپن کہاں گزارا ہے؟

ج: میں نے اپنی زندگی کے پہلے چھ سال جنوبی افریقہ میں گزارے لیکن اس دور کی بہت کم یادیں میرے ذہن میں رہ گئی ہیں۔ سولہ سال کی عمر تک ہم لوگ زیمبیا میں رہے۔ اگرچہ وہاں کا سماجی نظام کم وبیش انہی خطوط پر منظم تھا جن پر یورپ کا معاشرہ ہے پھر بھی یہ متعدد قوموں اور اخلاقی خطوط پر بنا ہوا معاشرہ تھا وہاں مڈل اور ہائی سکول میں مختلف اقوام کے بچے پڑھتے تھے۔ اور ذریعہ تعلیم انگریزی زبان تھی۔ مقامی افریقی بچے البتہ علیحدہ سکولوں میں جاتے تھے جہاں انہیں ان کی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی۔ ہائی سکولوں کے زمانے میں میری حسین اور خوبصورت یادوں میں ایک سالانہ ''فینسی ڈریس شو'' ہے اس شو کا اکثر حصہ چونکہ مختلف اقوام کے ملبوسات اور رسم ورواج کی عکاسی کرتا تھا لہذا یہ ابھی تک یاد ہے۔

س: آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی:

ج: جب میں نے ''او'' لیول تک تعلیم حاصل کی تو ہم فوری طور پر زیمبیاء چلے آئے۔ کیونکہ ہالینڈ میں زبان اور نظام دونوں ہی مختلف تھے۔ لہذا میں نے مقامی سسٹم میں سلسلہ تعلیم جاری رکھنے کے لئے ایک سال ضائع کرنے کے بجائے ''دفتری اور انتظامی امور'' سے متعلق ایک کورس میں داخلہ لینے کو ترجیح دی۔ اس کے بعد میں نے طالب علم کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی سے سائیکلوجی میں بہت اچھی تعلیم حاصل کی۔ آج کل میں فلسفہ اور تقابلی مذاہب کے موضوع پر کتابیں پڑھ رہی ہوں۔

س: کیا آپ نے کبھی ملازمت بھی کی؟

ج: مختلف ممالک میں کئی ملازمتیں کیں۔ مگر جونہی میں ماں بنی میں نے ملازمت ترک کردی کیونکہ میں ''فل ٹائم'' ماں بننا چاہتی تھی۔ اور یہ ہم دونوں کا فیصلہ تھا جس پر ہمیں کبھی ندامت نہیں ہوئی جہاں تک میرا تعلق ہے میرے خیال میں خاتون خانہ رہنا دوسری کسی نوکری یا ذمہ داری کے مقابلہ میں زیادہ کل وقتی ہے بلکہ بعض اوقات تو زیادہ وقت کا تقاضہ کرتا ہے۔ لیکن یقینی طور پر اس کا اجر کم ہی ملتا ہے اور عموماً اس کوئی قدر نہیں ہوتی۔

س: اپنی تعلیم کے دوران آپ نے ہالینڈ سے باہر بھی سفر کیا ہے؟

ج: زیمبیا میں اپنے ہائی سکول کے زمانے میں ہم چھٹیوں میں دوبار جنوبی افریقہ گئے، ہالینڈ آنے کے بعد اور کورس میں داخلہ لینے سے پہلے ہم نے سارے یورپ کی خوب سیر کی اور یوں ہمیں جرمنی، آسٹریا، سویزرلینڈ، اٹلی، بلجیئم اور لکسمبرگ دیکھنے کا موقع ملا۔

س: آپ کی ڈاکٹر خان سے کب، کہاں اور کیسے ملاقات ہوئی؟

ج: میں اپنے شوہر سے ہالینڈ میں جنوری 1962 میں ملی جہاں وہ ڈیلڈرور (جرمنی) سے اپنی چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے تھے۔ وہ پاکستان

کو پوسٹ کارڈ روانہ کرنے کے لئے اس کا ڈاک خرچ پوچھ رہے تھے جو اتفاقاً مجھے معلوم تھا۔ کیونکہ وہ ان دنوں اپنے وطن اور گھر کی یاد میں بُری طرح گھرے ہوئے تھے۔ لہٰذا وہ ایک ایسے فرد کے ساتھ مل کر اور باتیں کر کے خوشی محسوس کرنے لگے جو پاکستان کے بارے میں کم از کم معلومات رکھتا تھا۔

س: یہ اچانک تعارف آگے چل کر باقاعدہ تعلقات کا روپ کیسے اختیار کر گیا؟

ج: اس ابتدائی اور پہلی اتفاقیہ ملاقات کے بعد ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خط لکھنے کا وعدہ کیا اور میں آپ کو سچ بتاؤں اُس وقت میرے ذہن میں قطعاً یہ خیال نہیں تھا کہ اس بات کا کوئی سنجیدہ نتیجہ برآمد ہوگا۔ میرے نزدیک وہ (ڈاکٹر خان) بس ایک ایسے تنہا نوجوان تھے جنہیں اپنے وطن کی یاد نے گھیر رکھا تھا۔ چند ماہ کے بعد اس سے پہلے کہ وہ ٹیکنیکل یونیورسٹی برلن چلے جاتے۔ میں نے ان کے پاس ڈیسلڈروف جانے کی دعوت قبول کر لی۔ بعد میں جب مزید خطوط کا تبادلہ ہوا تو ہم دونوں نے اس بات پر اتفاق رائے کیا کہ ہمیں ایک دوسرے کو مکمل طور پر سمجھنا چاہیے۔ لہٰذا میں نے برلن میں ملازمت تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں میں نے تقریباً ایک سال کام کیا۔

س: جب آپ کے والدین کو علم ہوا کہ آپ کی دوستی ایک غیر ملکی کے ساتھ ہوگئی ہے تو ان کے کیا جذبات تھے؟

ج: ہم اس اعتبار سے انتہائی خوش نصیب رہے کہ نہ میرے والدین نے اور نہ ہی میرے شوہر کی والدہ نے ہمارے دوستانہ تعلقات پر اعتراض کیا کئی ملکوں میں رہنے اور مختلف اقوام کے لوگوں سے میل ملاپ کے باعث میرے والدین کافی روشن خیال تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کبھی کوئی غلط فہمی یا نوک جھونک نہیں ہوئی لیکن خوش قسمتی سے ہم نے ان مسائل کو حل کر لیا۔ البتہ میرے والدین نے مجھ سے اصرار ضرور کیا کہ میں شادی کے بارے میں اپنا فیصلہ نہایت دیکھ بھال کر اور احتیاط سے کروں۔ کیونکہ خوشحال شادیاں بہترین وقت میں شاذ و نادر ہی ہوتی ہیں اور جب مختلف ثقافتوں کا باہمی رشتہ ہوتا ہے تو ایسی شادیوں میں ایک دوسرے کو ساتھ لے کر چلنے اور ساتھ نبھانے کے لئے زیادہ جد وجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

س: آپ نے اور ڈاکٹر صاحب نے کس مرحلے پر شادی کرنے کا فیصلہ کیا؟

ج: برلن میں چند دن گزارنے کے بعد ہم دونوں نے باہمی طور پر اس بات پر اتفاق رائے کیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے عزت واحترام کے جذبات رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم سرکاری طور پر ایک دوسرے سے منسوب ہوگئے ہم نے اپنے چند پاکستانی اور جرمن دوستوں کو اس موقع پر مدعو کیا۔ کیونکہ جرمنی میں ہم دونوں کا رشتہ دار نہ تھا لہٰذا ہم نے ستمبر 1963 میں ہالینڈ چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ خوش قسمتی سے ڈیفلٹ کی ممتاز ٹیکنالوجیکل یونیورسٹی نے برلن میں پڑھائی کے اوقات کا بھی پورا پورا فائدہ دیا لہٰذا یوں تعلیم کے اوقات کا ہرج نہیں ہوا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے (ڈاکٹر عبدالقدیر خان) نے ایک ریکارڈ وقت میں اپنی تعلیم مکمل کی۔

س: شادی کی پیشکش پہلے کس طرف سے ہوئی؟

ج: یورپ میں روایت یہی ہے کہ لڑکے کی طرف سے لڑکی کے لئے شادی کی پیشکش کیجاتی ہے البتہ ہمارے ضمن میں یہ ایک سادہ اور باہمی

سمجھوتہ تھا جس میں دونوں طرف سے کوئی رسمی پیشکش نہیں ہوئی تھی۔ میرے شوہر نے البتہ اس رشتہ کی رسمی منظوری کے لیے میرے والدین اور اپنی والدہ سے درخواست کی اور دونوں طرف سے کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

س: شادی کے وقت آپکی عمریں کیا تھیں؟

ج: شادی کے وقت میری عمر 21 برس اور میرے شوہر کی عمر 27 برس تھی۔

س: شادی کی رسومات کہاں ادا کی گئیں؟

ج: چونکہ ہم دونوں ہی غیر ملکی تھے لہذا یہ ضروری نہیں تھا کہ ہم ٹی ہال ہی میں جا کر شادی کی رسم ادا کرتے اور پھر اس صورت میں ہمیں خاصی کاغذی کاروائی اور پیسہ بھی خرچ کرنا پڑتا۔ ٹی ہال کے حکام نے ہمیں مشورہ دیا کہ آپ لوگ پاکستان ایمبیسی جا کر شادی کر لیں اور نکاح نامہ کی فوٹو کاپی رجسٹریشن کے لئے روانہ کریں۔ چنانچہ ہم نے پاکستان ایمبسی میں شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ نہ صرف آسان نسخہ تھا بلکہ ایک نہایت ہی خوبصورت تقریب تھی۔

س: اس خوبصورت تقریب کی کچھ تفصیلات ہمیں بھی بتائیے؟

ج: جیسا کہ میں نے بتایا کہ ہمارے نکاح کی رسم تو ہیگ میں پاکستانی سفارتخانہ میں انجام پائی۔ ایمبسی میں فرسٹ سیکرٹری کے عہدہ پر فائز ایک صاحب جمیل الدین حسن تھے جنہوں نے اس وقت ہمارا نکاح پڑھایا۔ ان لوگوں نے ہمارے لئے ایک غیر رسمی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں سفارت خانہ کا سارا عملہ شامل تھا۔ جن میں ہم اکثر لوگوں کو بخوبی جانتے تھے۔ اس کے علاوہ میرے قریبی رشتہ دار اور کچھ دوست بھی اس موقع پر موجود تھے۔ اس وقت وہاں پاکستان کے سفیر عزت مآب قدرت اللہ شہاب تھے۔ جو میرے شوہر کی طرف سے گواہ بنے۔ جب کہ میری طرف سے یہ فرض میرے خالو نے ادا کیا۔ نکاح کی رسم ادا ہوئی تو اس کے بعد سفارت خانہ میں ہمارے لئے ایک پر تکلف چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس وقت مجھے پاکستان کی شادی بیاہ کی رسومات کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا۔ اور آج میں اس بات پر شکر بجالاتی ہوں کہ ہمارے شادی بڑی سادگی سے انجام پائی جب سرکاری طور پر شادی ہو گئی تو پھر میرے والدین نے ہمارے لئے ایک استقبالیہ دعوت کا اہتمام کیا جس میں کئی احباب ہمیں زندگی کے نئے سفر کے آغاز پر مبارک باد اور نیک تمنائیں دینے کے لئے آئے۔

س: ڈاکٹر خان کی فیملی کی طرف سے شادی کی تقریب میں کوئی شریک ہوا؟

ج: بدقسمتی سے شادی کی تقریب میں میرے شوہر کی طرف سے ایک شخص بھی شریک نہ ہو سکا حتیٰ کہ ان کے ایک انتہائی عزیز دوست جو اس وقت لندن میں تھے نہ آ سکے۔ ان کی یعنی میرے شوہر کی طرف سے صرف ان کا ایک ڈچ کلاس فیلو شادی کی تقریب میں شریک تھا۔ مجھے ہمیشہ اسی بات پر قلق رہا ہے۔ جب شادی کے تین سال بعد ہم پہلی دفعہ پاکستان آئے تو میرے شوہر کی فیملی نے چاہا کہ اب شادی ایک بار پھر پاکستانی رسومات کے مطابق ادا کر دی جائے لیکن اس بات پر وہ (ڈاکٹر خان) رضامند نہ ہوئے۔

س: آپ کی توقعات کیا تھیں اور ڈاکٹر خان کو شادی کے بعد آپ نے کیسا پایا؟

ج: چونکہ ہم نے شادی کرنے سے پہلے تمام متوقع مسائل اور ان کے حل کے بارے میں معاملات پر تبادلہ خیال کر لیا تھا لہذا خوش قسمتی سے شادی کے بعد کوئی بہت بڑا مسئلہ ہمارے سامنے نہیں ابھرا ہمیں ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے میں اتنا ہی وقت لگا جتنا عام طور پر نئے شادی شدہ جوڑے کو درکار ہوتا ہے کیونکہ اکٹھے رہنا اور بات ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ منسوب ہو کر رہنا اور بات ہے۔ وہ (ڈاکٹر خان) پڑھائی کے معاملے میں بڑے لائق فائق ہیں اور انہوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم پانچ سال سے کم مدت میں مکمل کی جبکہ عام طور پر طلباء اس کے لئے سات سال کا عرصہ صرف کرتے تھے۔ ان کی انجینئرنگ کے شعبہ میں پی ایچ ڈی مشہور عالمی جرائد میں ان کی بے شمار مطبوعات اور ایک کتاب کی ادارت وتدوین۔۔۔ یہ سب ان کی قابلیت اور سخت محنت کی تصدیق کرتے ہیں۔ جب میں اپنے کام سے فارغ ہو کر گھر واپس آتی تو وہ یونیورسٹی سے آ چکے ہوتے تھے اور یوں عموماً رات کا کھانا اکٹھے ہی کھاتے تھے۔ وہ جو کچھ کل تھے آج بھی وہی ہیں۔ یعنی انتہائی قدر دان شوہر:

س: جب آپ دونوں ''والدین'' بنے تو آپ کے کیا تاثرات تھے؟

ج: دو سال تک مختلف طبی علاج معالجہ کے بعد جب ہماری پہلی بیٹی پیدا ہوئی تو ہم دونوں بے انتہا خوش تھے۔ اس وقت ہماری شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے۔ میں ہر شخص کی طرح بڑی متفکر تھی کہ آخر گود ہری کیوں نہیں ہوتی میری دونوں بچیاں بیلجیم کے اس ہسپتال میں پیدا ہوئیں۔ جہاں کی رسم ہے کہ بچے کی پیدائش کے وقت اس کا باپ نہ صرف ہسپتال میں بلکہ زچہ کے پاس موجود ہو۔ جب میرے شوہر سے اس بارے میں ان کے جذبات یا تاثرات پوچھے گئے تو انہوں نے کہا کہ میں بغیر آزمائے کیسے فیصلہ کر سکتا ہوں بہر حال اس سارے کے موقع پر وہ ہسپتال میں موجود تھے اور ان کی موجودگی نے مجھے بے پناہ حوصلہ اور ہمت دی۔ جب ہماری پہلی بیٹی پیدا ہوئی تو اس سوال کا نام ونشان ہی نہیں تھا کہ ہم بیٹا چاہتے ہیں یا بیٹی۔ ہم دونوں کو صرف اس بات کی خواہش تھی کہ بچہ ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند ہو۔ جب میں دوسرے بچے کی امید سے تھی تو اکثر اپنے شوہر سے پوچھتی تھی کہ آپ کو لڑکے کی امید ہے کیونکہ میں جانتی تھی کہ پاکستان میں بیٹیوں کی کیا اہمیت اور قدر ہے مگر وہ ہر بار باصرار کہتے تھے ''مجھے ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا''۔

س: ڈاکٹر خان دوسروں کے مقابلے میں مصروف اور بڑی مختلف زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ اس کو کیسا محسوس کرتی ہیں؟

ج: جب ہم پاکستان آئے تو بچیاں بالترتیب سات اور پانچ سال کی تھیں۔ خود مجھے ایک ملک اور ثقافت سے دوسرے ملک اور ثقافت میں آ کر آباد ہونے کے مشکل مرحلہ سے گزرنا پڑا بچیوں کی تعلیم کا ایک بڑا مسئلہ تھا اور اس حقیقت سے یہ مسئلہ آسان ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا کہ میرے شوہر کو اپنے کام کے سلسلے میں دن رات مصروف رہنا پڑتا تھا۔ اور طویل سفر کرنے ہوتے تھے۔ مزید یہ کہ سیکورٹی کے پیش نظر میں دوسرے لوگوں سے میل ملاپ سے گریز کرتی تھی۔ لہذا ہمارا یہاں شروع کا وقت میرے لئے اس وقت تک ایک طرح سے اکلاپے کا دور تھا جب تک ہم نے یہاں چند دوست نہیں بنائے۔ صورت حال اس سے بھی بہتر نہیں ہوتی تھی۔ جب اپنی آمد کے پہلے سال کے

دوران ہی مجھ پر یرقان کا حملہ ہوا اور میں کافی عرصہ تک بیمار رہی مجھے اب بھی خیال آتا ہے کہ ان ابتدائی برسوں میں ہماری گھریلو زندگی کافی متاثر ہوئی حتیٰ کہ بچیاں اس وقت بھی اپنے باپ کی شکل نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ جب کہ انہیں اس کی سخت چاہت اور ضرورت ہوتی تھی۔ اگرچہ میں ان تقاضوں کی ضرورت سے بخوبی آگاہ تھی جو ان سے وابستہ تھے۔ اور میں نے پاکستان آنے کی تجویز سے مکمل طور پر اتفاق کیا تھا۔ لیکن اس سے مشکلات میں کوئی کمی نہیں آئی پھر جیسے جیسے وقت گذرتا گیا۔ معاملات خود بخود طے ہوتے چلے گئے ہیں۔ میں نے صورت حال کو قبول کرنا سیکھ لیا اور بچیوں نے بھی اس بات کو بخوبی ذہن نشین کر لیا کہ ان کو پاکستان کے مفاد کے لئے کیا قیمت ادا کرنا ہے۔ آج کل زندگی نسبتاً آسان اور سہل ہے میرے شوہر آج بھی گھنٹوں مصروف رہتے ہیں مگر اب وہ نسبتاً کم سفر کرتے ہیں۔ وہ بھی کم مدت کے لئے ہم نے چند اچھے دوست بھی بنائے ہیں جن کے پاس اگر ضرورت محسوس کروں تو ملنے کے لئے چلی جاتی ہوں۔

س: کسی مرحلہ پر ڈاکٹر خان نے آپ کو اپنے اس ارادہ سے آگاہ کیا کہ وہ مستقل طور پر پاکستان آباد ہونے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟

ج: جس وقت میری اپنے شوہر سے ابتدائی ملاقاتیں تھیں مجھے اس وقت سے اس بات کا علم تھا کہ اپنے ملک واپس جا کر وہاں کام کرنا ان کا ایک دیرینہ خواب اور آئیڈیل ہے یہ نہیں کہ جو کچھ بھی کام کرنے کو مل جائے بلکہ ایسا کوئی کام جسے وہ سمجھیں کہ اس سے پاکستان کی ترقی میں کوئی مدد ملے گی۔ اور ان سے شادی کرتے ہوئے خود بخود میں نے اس حقیقت کو بھی قبول کیا۔ انہوں نے پہلے کئی بار واپس آنے کے سلسلے میں رابطہ کیا۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا لیکن جب دسمبر ۱۹۷۵ میں چھٹیوں میں پاکستان آئے اور انہیں ان کی موجودہ ملازمت کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے یوں محسوس کیا جیسے وہ اسی وقت کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے درمیان اس سلسلہ میں بہت ہی مختصر گفتگو ہوئی اور اس کے بعد انہوں نے بڑی فراخدلی سے پیش کش قبول کر لی۔

س: آپ نے پاکستان کو کیسا پایا؟

ج: مستقل طور پر پاکستان آنے سے قبل ہم چار بار یہاں آ چکے تھے لہذا میں اس تبادلے کے لئے اچھی طرح تیار تھی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اچھے خاصے آباد گھر میں سسرال کے مہمان رہنا اور تین چار ماہ تک خالی گھر میں خانہ داری کے ماحول کا سماں پیدا کرنے کا انتظار کرنا بڑی مختلف باتیں ہیں ان ابتدائی مہینوں میں سواری کا مسئلہ اپنی جگہ تھا۔ لیکن جلدی ہم نے زندگی کو اس ڈگر پر چلا لیا۔ پھر جب ایک بار سواری اور سکول کا مسئلہ حل ہو گیا تو زندگی معمول پر آ گئی ہمیں صحیح معنوں میں آباد ہونے میں تقریباً نو ماہ کا عرصہ لگا حتیٰ کہ خود میرے شوہر کو بھی کیونکہ وہ تقریباً پندرہ سال گھر سے دور رہے تھے۔

س: پاکستان میں آپ نے کن مقامات کی سیر کی اور آپ نے انہیں کیسا پایا؟

ج: جب ہم پہلی بار پاکستان آئے تو ہمارا کوئی بچہ نہیں تھا۔ اور ہم بہت تھوڑا گھومے پھرے تھے۔ جب آپ پہلی بار کسی ملک کو دیکھتے ہیں اور بہت سے کام کرتے ہیں تو واقعات اور مقامات عام طور پر یاد نہیں رہتے میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہوا اس کے بعد جب ہم آئے تو بچے ہمارے ساتھ تھے۔ لہذا ہمارا آنا جانا اور بھی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں ہم نسبتاً بہت کم مختلف مقامات کو دیکھنے کے

لئے گئے ہیں۔اور یہ بڑی دل سوزی کی بات ہے کیونکہ یہاں بے شمار خوبصورت چیزیں ایسی ہیں جنہیں ابھی دیکھنا باقی ہے۔ میرے والدین کئی بار یہاں ہم سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔اور اس موقع پر ہم نے انہیں کچھ مقامات دکھانے کی کوشش کی ہم نے گلگت سے خوب لطف اٹھایا ہے۔اور ہم سوات بھی گئے ہیں۔لیکن کسی اور وادی جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لاہور اور ٹیکسلا تاریخی اعتبار سے دلچسپ شہر ہیں اگر چہ میں ان کو ''خوبصورت'' کہنے سے گریز ہی کروں گی۔ میرے شوہر کا خاندان کراچی میں آباد ہے چنانچہ ہم وہاں بھی باقاعدگی سے جاتے رہتے ہیں۔اپنے پہلے دورہ کے وقت ہم کوئٹہ گئے تھے لیکن جو چیز مجھے زیادہ یاد رہ گئی وہ وہاں کے سرسبز وشاداب باغات اور لذیذ سیب ہی ہیں۔مری اور ایبٹ آباد گرمیوں میں سیر کیلئے بڑے خوبصورت ہیں۔اگر چہ ہم حالیہ برسوں میں وہاں نہیں گئے اس کی وجہ یہ ہے کہ جس سکون اور خاموشی کیلئے وہاں جایا کرتے تھے اسے اب وہاں تلاش کرنا بڑا مشکل ہے مجھے گرمیوں کے موسم کے لئے مری میں مکان حاصل کرنے کا خیال کبھی اچھا نہیں لگا۔اس کے بجائے میں اس بات کو ترجیح دیتی ہوں کہ جب بھی موقع ملے انسان دو تین دن پہاڑ پر گذار آئے۔

س: آپ نے پاکستان میں مختلف رسومات اور رواج دیکھے ہوں گے۔ان کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

ج: پاکستان آنے سے پہلے ہی میں نے دنیا کے مختلف حصوں کا سفر کیا تھا۔اور مجھے امید ہے کہ میں بغیر کسی تعصب کے کسی بھی نئے رسم و رواج کو دیکھ سکتی ہوں۔یہاں پاکستان کے رسوم میں مجھے جو بات سب سے زیادہ پسند ہے اور جس کی میں بے پناہ تعریف کرتی ہوں یہ ہے کہ یہاں چھوٹی عمر کے بچے کو ہی بڑے بوڑھوں اور عمر رسیدہ افراد کی عزت اور مدد کرنے کی تعلیم اور تربیت دی جاتی ہے میں سمجھتی ہوں کہ یہ بات بڑی اہم ہے نہ صرف عمر رسیدہ افراد کے نقطہ نظر سے بلکہ خود ان کے پوتوں اور نواسوں کے حوالے سے بھی کیونکہ وہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کو وقت دیا جائے اور کوئی بھی آیا کسی صورت میں بھی اس کا متبادل نہیں ہو سکتی۔شادی بیاہ کی رسوم میں جان تو گئی ہوں مگر میں عموماً شادی کی تقریبات میں شرکت نہیں کرتی۔ کیونکہ میری وہاں موجود خواتین سے شناسائی نہیں ہوتی۔ مجھے شادی کے تین چار دنوں میں کھانے، کپڑوں اور دوسری رسومات پر بے دریغ خرچ بڑا عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔میں ہمیشہ سوچتی ہوں کہ اس رقم سے جوڑا اپنی ضرورت کی مطابق اور زیادہ مفید چیزیں خرید سکتا ہے۔مگر ظاہر ہے کہ یہ صرف میرے ذاتی خیالات ہیں۔

س: آپ پاکستان کی ثقافتی سرگرمیوں اور ماحول کا ہالینڈ کے حوالے سے کیسے موازنہ کریں گی؟

ج: ثقافتی اعتبار سے کئی میدانوں میں، موسیقی کے پروگرام، سینما، ٹی وی وغیرہ میں مماثلت تلاش کی جا سکتی ہے ان شعبوں میں یہاں نسبتاً کم کام ہوا ہے ''زندہ سٹیج شو'' اور ڈرامہ وغیرہ کے ضمن میں یہاں بہت تھوڑا کام ہوا ہے۔دوسری بات جوان لوگوں کے لئے ثقافتی سرگرمیاں ہیں تو میرے خیال میں یہاں اس حوالے سے اور بھی کم کام ہوا ہے کیونکہ سرمایہ کی کمی ہے۔جب کہ ہالینڈ میں اس بارے میں حکومت کی طرف سے یا مراعات دے کر خاصا سرمایہ خرچ کیا جاتا ہے۔

س: کیا ڈاکٹر خان نے آپ کو اپنی سرگرمیوں اور اپنے پراجیکٹ کے بارے میں اعتماد میں لے رکھا ہے؟

ج: جی ہاں! ہم ہمیشہ ایک دوسرے کو ہر بات بتاتے ہیں، درست ہے کہ میں پراجیکٹ کے فنی پہلوؤں کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکتی لیکن میں بعض خاص معاملات اور مسائل کے بارے میں جانتی ہوں اور مجھے خبر ہے کہ عام طور پر کیا ہوتا رہتا ہے۔

س: بیرون ملک لوگ یقیناً آپ سے ڈاکٹر خان صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں گے ایسے میں آپ صورت حال پر کیسے قابو پاتی ہیں؟

ج: شروع شروع میں لوگ واقعی مجھ سے پوچھتے تھے کہ آپ کسی ڈاکٹر خان نامی شخص کو جانتی ہیں اور میں یہ کہہ کر انکار کر دیتی تھی پاکستان میں یہ ایک عام سا نام ہے۔ لیکن بعد میں جب ان (ڈاکٹر صاحب) پر مقدمہ چلا تو یہ بات ایک طرح سے ریکارڈ قائم کرنے کی حیثیت اختیار کر گئی جب ان لوگوں کو بتایا جاتا کہ ڈاکٹر خان نے محض فنی معلومات حاصل کرنے کے لئے جو خطوط قلم بند کئے تھے انہیں خفیہ دستاویزات کی فوٹو کاپی حاصل کرنے اور اہم راز چوری کرنے کے مترادف قرار دیا جا رہا ہے۔ تو ان کے چہروں پر بے یقینی کے تاثرات ابھرتے تھے۔ مجھے اس بات سے زیادہ دکھ پہنچتا تھا کہ بعض لوگ حتیٰ کے ہمارے چند دوست بھی ان باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے جو ہم انہیں خود بتاتے تھے بلکہ اخبارات اور رسائل میں شامل ہونے والی سنسنی خیز خبروں کو درست مانتے تھے۔ حتیٰ کہ اب بھی پریس کا ایک حصہ ایسی ہی پرانی اور جھوٹی باتوں کو شائع کر رہا ہے۔ اور میری ذہنی کوفت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا میرے شوہر کوشش کر رہے تھے کہ اب اس سارے بے مقصد سلسلہ کو بعض غیر ملکی اخبارات اور رسائل کے خلاف قانونی کاروائی کر کے ختم کر دیا جائے ''دی نیشن انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹریبون'' پہلے معافی مانگ چکا ہے اور ہمیں امید ہے کہ دوسروں کو بھی قانونی چارہ جوئی کا سامنا کرنا ہوگا۔

س: کیا آپ ایسے واقعات بتا سکتی ہیں جن سے آپ کو احساس ہوا ہو کہ آپ ایک عظیم انسان کی رفیقہ حیات ہیں؟

ج: لفظ ''عظیم'' ایک روایتی اصطلاح ہے میرے لئے وہ اقدار باطنی کے اوصاف کی حیثیت سے عظیم ہیں اور اس لئے نہیں جو کچھ دوسرے لوگ کہتے ہیں۔ رائے عامہ کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے آج کے مشاہیر آنے والے کل فراموش کر دئے جاتے ہیں۔ میں یہ بات ضرور محسوس کرتی ہوں کہ میرے شوہر نے اپنے شعبہ میں بے پناہ کام کیا ہے اور پاکستان کو ایٹمی ٹیکنالوجی میں ترقی دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور یہ وہ آورش اور خواب ہے جو ان کے ذہن میں بہت عرصہ پہلے سے تھا مجھے اس بات پر بے پناہ مسرت ہوتی ہے کہ انہوں نے جو کچھ کرنا چاہا وہ کر لیا۔ اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے اس سے میرے شوہر کو بڑی طمانیت میسر آئی ہے، اپنے شوہر کے اس قدر نامور اور مشہور ہونے کا یہ پہلو مجھے بہر حال قطعاً پسند نہیں کہ بعض لوگوں کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں بیگم ڈاکٹر خان ہوں تو وہ مجھ سے قطعی طور پر مختلف سلوک کرتے ہیں، میں اس بات کو پسند کرتی ہوں کہ میں جو کچھ ہوں مجھ سے اسی حیثیت کے مطابق سلوک کیا جائے نہ کہ محض اس حوالے سے کہ میں ایک مشہور اور مقبول شخصیت کی بیوی ہوں۔ وی آئی پی کی مراعات میں بڑا سرور آتا ہے مگر ہر شخص کو اپنی شناخت برقرار رکھنی چاہیے۔

س: آپ اپنی بیٹیوں کو مستقل میں کیا بنتے دیکھنا پسند کریں گی؟

ج: ہمارے ذہن میں اپنی بیٹیوں کے لئے کوئی خاص پیشہ یا شعبہ نہیں ہے۔ ہم یہ ضرور چاہیں گے کہ وہ ایسے شعبوں کا انتخاب کریں جن میں ملازمت کے مواقع زیادہ ہیں یا جن شعبوں میں ضروریات بڑھ سکتی ہیں، ان دونوں نے سائنس کے مضامین اختیار کیے ہیں مگر کسی نے فزکس یا میٹالرجی میں خصوصی دلچسپی ظاہر نہیں کی ایک بات بہر حال یقینی ہے کہ وہ میڈیکل نہیں پڑھنا چاہتیں۔

س: ڈاکٹر خان کا اپنے بچوں کے ساتھ کیسا رویہ ہوتا ہے؟

ج: وہ نہایت اصول پرست مگر بے پناہ محبت کرنے والے باپ ہیں۔ ان (بیٹیوں) کو ان کی خواہشات کے مطابق کوئی ایسی چیز دینے سے گریز نہیں کریں گے۔ جس کا جواز اور ضرورت ہو لیکن وہ جواب میں ان (بیٹیوں) سے فرمانبرداری، پڑھائی میں سخت محنت اور عمدہ سلوک کی توقع رکھتے ہیں۔

س: کیا آپ ہمیں ڈاکٹر خان کی عادات کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟

ج: ان کی عادات میں سے میں سب سے زیادہ جس عادت کی تعریف کرتی ہوں، اور اسے سراہتی ہوں وہ یہ ہے کہ وہ ہر وقت ضرورت مند، ان کے خاندان کا ہو یا دوست ہو،ان کا ادارہ یا کوئی اور شخص۔ انہیں لوگوں کو چیزیں دینا بے حد پسند ہے۔ اور اگر انہیں کسی شخص کی پسند یا مشغلہ کے بارے میں علم ہو تو وہ موقع ملنے پر غیر ملک سے اس کے لئے اس کی پسند کی کوئی چیز ضرور لائیں گے۔ اگر کسی کو ان کی فنی مہارت کی ضرورت ہو تو وہ اپنی خدمات کی پیش کش میں کوئی پس و پیش نہیں کریں گے۔ خود ان کا اپنے کام کے علاوہ کوئی مشغلہ نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم لوگوں کو ان کی سالگرہ، شادی کی سالگرہ یا ایسے ہی خوشی کے مواقع پر ان کو تحفہ دینے کے لئے کئی بار سوچنا پڑتا ہے۔ اور یہ خاصا مشکل محسوس ہوتا ہے حتیٰ کہ گھر میں شام کے وقت بھی یا تو فنی معلومات پر مبنی کتابیں یا سوانح حیات پڑھتے رہتے ہیں یا پھر وہ اپنا لکھنے کا کام کرتے رہتے ہیں۔ جب وہ طالبعلم تھے اس وقت بھی وہ فرش پر بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے اور ان کے چاروں طرف کتابیں بکھری ہوتی تھیں۔ انہیں جانوروں سے بڑی محبت ہے خاص طور پر بلیوں اور ایک خاص کتے سے! میرے خیال میں ان کے والد نے ان کی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے کیونکہ وہ انہیں چڑیوں اور کووں کا شکار نہیں کرنے دیتے تھے جب کہ دوسرے لڑکے عموماً ایسا کرتے تھے۔ ان کے والد نے انہیں زندگی کی ہر صورت اور شکل سے محبت کرنی سکھائی اگرچہ ان کو میری یہ عادت زیادہ پسند نہیں کہ میں ہر قسم کے زخمی اور بھولے بھٹکے جانوروں کی دیکھ بھال کرتی ہوں لیکن وہ ایسا کرنے سے کبھی منع نہیں کریں گے۔ وہ بچوں کے ساتھ ایسی حرکتیں اور باتیں کرکے جن کے بارے میں انہیں علم ہو کہ بچے اس سے اتفاق نہیں کرتے خوش ہوتے ہیں لیکن وہ ایسا ہمیشہ سنجیدگی سے نہیں بلکہ ازراہ مذاق کرتے ہیں۔ جہاں تک بچوں کی تعلیم اور خود ان کے اپنے کام کا تعلق ہے وہ اس ضمن میں بڑے سنجیدہ ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی حس ظرافت بھی بڑی تیز ہے۔ حتیٰ کہ یورپ میں اساتذہ اور کام کرنے والے دوست ان کی اس عادت کی تعریف کرتے تھے۔ میں یہاں اس حوالے سے ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گی۔ ۱۹۸۴ میں ہم نے اپنی شادی کی ۲۰ ویں سالگرہ منائی اس موقع

پر جب خوش گپیاں ہو رہی تھیں، انہوں نے مجھے کہا ''خوشیوں بھرے ۱۹ برسوں کا بہت بہت شکریہ'' جب میں نے ان سے قدرے حیرت سے پوچھا کہ کیا آپ ایک سال فراموش کر گئے تو انہوں نے اپنے چہرے پر قدرے متانت طاری کرتے ہوئے کہا میں نے ان تمام دنوں کو ملا کر ایک سال کاٹ لیا ہے ''جب تم مجھ سے خوش نہیں تھیں ناراض تھیں''

س: ڈاکٹر خان اپنی نجی زندگی میں آپ پر کس حد تک انحصار کرتے ہیں؟

ج: میں خود کو تو یہی باور کراتی ہوں کہ وہ مجھ پر بے حد انحصار کرتے ہیں۔ لیکن دیانت داری کا تقاضا یہی ہے کہ میں اس بات کو تسلیم کروں کہ ایسا نہیں کیونکہ وہ بہت زیادہ آزاد اور خود مختار آدمی ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ شادی کے اتنے برس گزرنے کے بعد ہم کسی حد تک ایک دوسرے پر انحصار کرنے لگے ہیں لیکن یہ عام اوسط انحصار سے زیادہ نہیں۔

س: ڈاکٹر خان کے لباس اور دوسری عادات پر آپ کا کتنا اثر ہے؟

ج: ہم عموماً کپڑوں کی خریداری اکٹھے ہی کرتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کی رائے طلب کرتے ہیں ان کا ذوق ایسا ہے کہ مجھے ان سے اتفاق کرنا پڑتا ہے خواہ میں اس وقت موجود نہ بھی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ عموماً میرے لیے کپڑے خریدتے ہیں جو میری پسند کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ جہاں تک دوسری باتوں پر میرے اثر کا تعلق ہے تو یہ کہنا مشکل ہے اتنا وقت اکٹھے بسر کرنے کے بعد یقینی طور پر ہم ایک دوسرے کی پسند اور ناپسند پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن میں اب کسی مشکل میں خود کو نہیں ڈالنا چاہوں گی کہ میں ان پر کس حد تک اثر رکھتی ہوں۔

س: اگر ڈاکٹر خان ہالینڈ جا کر آباد ہونے کا فیصلہ کریں تو آپ کو کیسا محسوس ہوگا؟

ج: چونکہ ایسا ہونے کا امکان نہیں لہذا میں ایسی باتیں نہیں سوچتی۔ یہ بات البتہ میرے لئے اس اعتبار سے بڑی دلچسپ ہوگی کہ میرے والدین وہاں آباد ہیں۔ لیکن یہاں اپنے گھر بار کو چھوڑنے، خوبصورت باغیچہ کو چھوڑنے، اپنے تمام جانوروں کو چھوڑنے اور ایک سرد ملک کی طرف دوبارہ چلے جانے کا خیال میرے لئے کوئی زیادہ باعث کشش نہیں۔ اب بچیوں نے بھی یہاں اپنے دوست بنا لئے ہیں اور میرے خیال میں ایک بار پھر نقل مکانی کرنا کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوگا۔

س: جب ہالینڈ میں ڈاکٹر صاحب پر مقدمہ چل رہا تھا، تو ان کی کیا کیفیت تھی اور آپ نے اس سلسلہ میں کیا کردار ادا کیا؟

ج: جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ کسی پیشگی اطلاع کے بغیر ان کی غیر موجودگی میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے تو انہیں شدید ذہنی دھچکہ لگا۔ انہوں نے فوری طور پر تدارک کے لئے جوابی اقدام کیا اور اپیل دائر کر دی جسے کافی دیر تک التوء میں ڈالے رکھا گیا۔ اور اس بات کا ان کے ذہن پر بڑا بوجھ تھا۔ یہ صورت حال اس لحاظ سے اور زیادہ سنگین ہوگئی کہ وہ ابھی HZ (Herpes Zoster) کی بیماری کے حملہ سے پوری طرح سے صحت یاب نہیں ہوئے تھے۔ اور اس سے ان کی صحت اور توانائی بری طرح متاثر ہوئی تھی بہر حال یہ دور ہماری زندگی کا انتہائی ڈرامائی اور سخت جانفشانی کا دور تھا، جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے ان کی جہاں تک ممکن تھا بھرپور حوصلہ افزائی کرنے اور ہمت

بندھانے کی کوشش کی۔ جب وہ بیمار تھے میرا کام نسبتاً آسان تھا کیونکہ یہ صرف جسمانی دیکھ بھال سے تعلق رکھتا تھا اس کے مقابلہ میں ذہنی اور اخلاقی امداد کرنا قدرے مشکل کام ہے کیونکہ اس کے ضمن میں قطعاً اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ کسی شخص کو کس حد تک کامیابی ہوگی خوش قسمتی سے وہ دور اب ماضی کا حصہ ہو کر پیچھے رہ گیا ہے اور اب ہم مستقبل کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ آنے والے دن ہمارے لئے کیا لا رہے ہیں۔

س: ڈاکٹر خان پر چلائے جانے والے مقدمہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: میرا ذاتی طور پر خیال ہے کہ میرے شوہر کے خلاف مقدمہ اس لئے دائر کیا گیا کہ ہالینڈ کی حکومت پر اس کے دوسرے حصہ داروں کی طرف سے یہ الزام عائد کیا جا رہا تھا کہ وہ غفلت کا شکار ہوگئی ہے۔ اس دباؤ سے نجات حاصل کرنے کیلئے انہوں نے میرے شوہر کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ یہ مقدمہ جاسوسی کا نہیں تھا۔ جیسا کہ نہایت سنسنی خیز انداز میں اسے بعض عالمی اخبارات میں بیان کیا گیا۔ بلکہ ایسے الزام کے تحت وہ اگر سچ بھی ثابت ہو جاتا تو بعض ممالک میں قابل سزا نہیں جیسا کہ ہالینڈ میں مقیم کوئی غیر ملکی اگر کسی مقامی باشندے سے کوئی خاص معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے اس کا بنیادی طور پر مطلب یہ ہے کہ اگر مثال کے طور پر کوئی شخص ہالینڈ میں کسی فرد یا کمپنی کو خط لکھ کر بعض فنی یا غیر فنی معلومات فراہم کرنیکی درخواست کرے، یہ جانے بغیر کہ صحیح یا غلط طور پر یہ معلومات مخصوص نوعیت کی ہیں اس پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے میرے شوہر کے ضمن میں ہوا یہ کہ جن معلومات کے لئے درخواست کی گئی تھی۔ وہ ”مخصوص“ کے زمرے میں نہیں آتی تھیں۔ اور یہ ایسا مواد ہے جو گزشتہ پچیس سال سے بازار میں کھلے عام دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ مقدمہ کی کاروائی میں کئی غلطیاں کی گئیں جس کے باعث مقدمہ (ڈاکٹر صاحب کی) غیر حاضری میں چلانے کی نوبت آئی اور اس لئے اس حقیقت میں کوئی فرق نہیں آیا کہ ایسے مقدمات خواہ سچ ہوں یا جھوٹے ان سے متعلقہ شخص اور اس کے اہل خانہ کے ذہنوں پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اور وہ ان سے بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔

س: ہالینڈ میں ڈاکٹر خان کے مقدمہ کے بارے میں لوگوں کا کیا خیال ہے؟

ج: میرا خیال ہے کہ اکثریت بس وہی کچھ جانتی ہے جو کچھ وہ اپنے ملک کے یا عالمی اخبارات و رسائل میں پڑھتی ہے اور اس کے لئے ان کو کوئی دوش نہیں دیا جاسکتا۔ ہم بھی تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ آخر کار اخبارات سے یہ توقع تو کی جاتی ہے کہ وہ درست اور صحیح خبریں فراہم کریں ورنہ تو یہ پھر ہم تک کیسے پہنچتی ہیں۔ صرف وہی لوگ اصل صورت حال سے واقف ہیں جو ہمارے واقف یا شناسا ہیں۔ اخبارات کے مطابق بلکہ خود ہمارے بعض (سابق) پڑوسی بھی ایسی باتیں کرتے تھے جو درست نہیں تھیں۔ لیکن ممکن ہے کہ یہ سب خوش فہمی یا غلط فہمی کا نتیجہ ہو جو اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں اور باتوں کے بعد پیدا ہوسکتی ہے۔ ہمارے تمام احباب اور میرے شوہر کے ساتھ کام کرنے والے تمام لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے (میرے شوہر نے) کوئی جرم نہیں کیا۔ کوئی غلط حرکت نہیں کی۔ ان کے خلاف غیر منصفانہ مقدمہ کے خلاف اپیل میں پروفیسروں کی ایک بڑی تعداد نے میرے شوہر کی بھرپور حمایت کی تھی۔

س: یہاں آباد ہونے کے بعد آپ یقیناً کئی بار ہالینڈ بھی گئی ہوں گی۔ کیا ڈاکٹر صاحب کے خلاف مقدمہ کے بعد کو اس حوالے سے کوئی مشکل یا پریشانی کا سامنا ہوا؟

ج: یہاں آباد ہونے کے بعد میں کئی بار ہالینڈ گئی ہوں۔ مجھے کہیں بھی کبھی کوئی مشکل نہیں ہوئی نہ تو ہالینڈ میں اور نہ ہی ایمسٹرڈم ائر پوٹ پر۔ ہاں البتہ ایک بار مجھے تھوڑی سی پریشانی ضرور محسوس ہوئی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں پولیس کے پاس اپنے ویزا میں توسیع کیلئے گئی۔ ایک رات پہلے ٹی وی پر رسوائے زمانہ بی بی سی کی فلم ''پراجیکٹ ۷۰۶ اسلامی بم'' دکھائی جا چکی تھی اور یہ ساری فلم غلط معلومات اور خود ساختہ پراپیگنڈہ پر مبنی تھی۔ کلرک نے جب میرا پاسپورٹ دیکھا اور اسے معلوم ہوا کہ میں پاکستان سے آئی ہوں تو اس نے مجھ سے ایٹمی پروگرام کے بارے میں یونہی گپ شپ شروع کر دی اور بولا ''کیا آپ اس ڈاکٹر خان کو جانتی ہوں اور پھر میرے جواب کو سنے بغیر بولا مجھے یقین ہے کہ اس (ڈاکٹر خان) نے اس سارے چکر میں لاکھوں ڈالر ضرور کما لئے ہوں گے۔ میں پھر بھی خاموش رہی۔ میں اسے قطعاً احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ہی ڈاکٹر خان کی بیوی ہوں۔ وہ سر جھکائے بولے جا رہا تھا۔ اور میں چاہتی تھی کہ وہ سر اٹھائے تو میں اسے بتاؤں کہ میرا شوہر پاکستان میں کسی بھی دوسرے سرکاری ملازم کی طرح چار سو ڈالر ماہوار تنخواہ لیتا ہے کاش میں اسے اپنے شوہر کی تنخواہ بتا سکتی۔

س: پاکستان میں آپ کا رابطہ کن لوگوں سے رہتا ہے اور کیا وہ آپ کے شوہر کی مصروفیات کے بارے میں دریافت کرتے ہیں؟

ج: شروع شروع میں سیکورٹی کی وجہ سے میں اجنبی اور باہر کے لوگوں سے بالکل نہیں ملتی تھی اس وقت ہم صرف ان لوگوں سے ملتے جلتے تھے جو پراجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔ البتہ اب مجھے ادھر ادھر گھومنے پھرنے کی نسبتاً زیادہ آزادی ہے لیکن چونکہ میں عام طور پر خود میں گم رہتی ہوں اور طبعاً بھی خاموش رہتی ہوں لہذا پھر بھی میرا احباب دوستوں کا دائرہ بہت محدود ہے اور میرے شوہر کی مصروفیات اور سرگرمیاں اب سارے ملک میں اتنی مشہور اور جانی پہچانی ہیں کہ کوئی شخص مجھ سے اس کے بارے میں پوچھتا ہی نہیں۔

س: آپ اپنا وقت کیسے گزاراتی ہیں اور آپ کی بچیوں کی تعلیم جارہی ہے۔

ج: میرا زیادہ تر وقت امور خانہ داری اور میرے مشاغل میں گذر جاتا ہے میرے مشاغل میں سے ایک جانور پالنا ہے۔ اور ہمارے گھر میں ایک چھوٹا سا ''چھڑیا گھر'' بنا ہوا ہے۔ اس میں تین کتے بلیاں' ایک طوطا' مچھلیاں' کچھوے' خرگوش اور بے شمار پرندے ہیں۔ جبکہ میرے دوسرے مشاغل میں سینا پرونا اور نفسیات' فلسفہ اور مختلف مذاہب کے بارے میں کتب کا مطالعہ شامل ہے۔ یہ درست مشاغل ایسے ہیں جن میں وقت صرف ہوتا ہے۔ لہذا میں کبھی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتی اور اس کے برخلاف مجھے کبھی اتنا وقت میسر نہیں آتا کہ میں کچھ چاہوں وہ سب کچھ کرلوں۔ بچیوں کی تعلیم کی میرے نزدیک بے حد اہمیت ہے۔ کیونکہ میں محسوس کرتی ہوں۔ کہ ان کے مستقبل کی یہی بہترین ضمانت ہے جو ہم انہیں دے سکتے ہیں۔ میں ان کی تعلیم میں پوری طرح دلچسپی لینے کی کوشش کرتی ہوں اور محض یہ کہہ کر نہیں رہ جاتی ''کہ جاؤ جا کر اپنا سکول کا کام کرو' اکثر مضامین کا تو مجھے پتہ ہے کہ کیا پڑھایا جا رہا ہے مگر حساب اب اس قدر

تیزی سے بدل گیا ہے کہ میں خود اکثر و بیشتر بھول جاتی ہوں۔ دونوں بچیاں پڑھائی میں بڑی اچھی ہیں۔ اور میں بڑی شکر گذار ہوں کہ ہمیں بڑے اچھے بچے نصیب ہوئے اور یہ بچے میرے اور میرے شوہر کیلئے فخر و مسرت کا سر چشمہ ہیں۔

س: آپ ڈاکٹر خان کی اندرون خانہ زندگی اور مصروفیات کے بارے میں کیا کہنا پسند کریں گی؟

ج: میں زیادہ خوش ہوں گی اگر میں آپ کو ان کی گھر سے باہر کی زندگی کے بارے میں کچھ بتا سکوں کیونکہ میں محسوس کرتی ہوں کہ انہیں گھر پر زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہیے۔ اور اس آدھ گھنٹہ کی سیر کے علاوہ بھی ورزش کرنی چاہیے جو سیر وہ روزانہ کرتے ہیں۔ یہ ان کی صحت کیلئے مفید ہوگا بہر حال جہاں تک ان کا اندرون خانہ مصرفیات کا تعلق ہے تو کسی نہ کسی شکل میں یا تو کوئی کام کرتے رہتے ہیں یا کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ میری زیادہ سے زیادہ مدد کریں خواہ کوئی بھی کام ہو بجلی کے فیوز بلب تبدیل کرنے یا اچانک مہمانوں کے خاطر مدارت کے بعد پتیلیوں کو صاف کرنے کا۔ کیونکہ آپ کو شاید خبر نہیں کہ ہمارے گھر میں کوئی فل ٹائم نوکر نہیں ہے۔

س: ڈاکٹر خان کی فیملی میں سے آپ کو سب سے زیادہ کون پسند ہے؟

ج: یہ کوئی زیادہ الجھے دار سوال نہیں اس کنبہ میں کئی لوگ ایسے ہیں جنہیں میں دوسروں کی نسبت زیادہ بہتر طور پر جانتی اور سمجھتی ہوں لہذا میرے خیال میں یہ بات نسبتاً زیادہ بہتر طور پر جاننے کی ہے پسند کرنے کی نہیں۔ ہر شخص ہی میرے ساتھ بہت اچھا رہا ہے لیکن حالات گذرنے کے بعد اب ان (ڈاکٹر خان) کی چھوٹی بہن اور تیسرے بھائی کو بہتر طور پر سمجھنے لگی ہوں۔ بہن کو یوں کہ جب بھی ہم پاکستان آئے تو اس کے پاس میرا قیام ہوتا تھا۔ اور اب بھی جب کراچی جانا ہو تو اس کے گھر ہی ٹھہرتے ہیں اور ان کے بھائی سے یوں کہ جب ہم ابھی ہالینڈ ہی میں تھے۔ وہ ہمارے یہاں تقریباً اڑھائی سال رہا تھا۔

س: ڈاکٹر خان کے والدین نے پہلی بار آپ کو دیکھا تو آپ کے خیال میں ان کے کیا تاثرات تھے؟

ج: افسوس کہ میں اپنے شوہر کے والد کو نہیں مل سکی کیونکہ وہ ہماری شادی سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے جب میں پہلی بار پاکستان آئی اردو نہیں سمجھ سکتی تھی اور مجھے یقین ہے کہ مجھے ہر بات کا ترجمہ کر کے نہیں بتایا جا رہا تھا۔ یہ ممکن بھی نہیں تھا لہذا میرے لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ میری ساس کا میرے بارے میں پہلا تاثر کیا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ انہوں نے کہا ''میں اپنے خاندان میں ایک غیر ملکی بہو دیکھ کر خوش ہوں تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر پھر اور کیا دریافت کر سکتی تھی۔ اس وقت سے مجھے احساس ہوا کہ انہوں نے مجھے پسند کیا اور وہ مجھے بہت پیار کرتی ہیں وہ اب بہت عمر رسیدہ ہوگئی ہیں ان کی عمر ۸۲ سال ہے۔

س: ظاہر ہے کہ آپ دوسری خواتین کی طرح ادھر ادھر گھوم پھر نہیں سکتیں اور ایک یورپی خاتون کی حیثیت سے آپ کو یہ عجیب بھی محسوس ہوتا ہوگا۔ آپ ایسی صورت حال کا کیسے مقابلہ کرتی ہیں؟

ج: جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا کہ مجھے یہاں جو بات سب سے زیادہ ناپسند ہے وہ لوگوں کا بلا مقصد گھومتے پھرنا ہے میں نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا ہے کہ میں کسی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گی اور اس صورت حال میں خاصی بہتری ہوئی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ لوگ پھر بھی

مجھے دیکھتے ہیں۔ لیکن میں اس کی پرواہ نہیں کرتی۔ کیونکہ میں تو انہیں نہیں دیکھتی۔ صورت حال کو میں نے یوں بھی قابو کیا ہے کہ میں خریداری کے لئے بہت کم ہی گھر سے نکلتی ہوں۔ مجھے شاپنگ کا زیادہ شوق بھی نہیں اور میں یہ کام زیادہ سے زیادہ دوسروں پر چھوڑ دیتی ہوں۔ مجھے اب بھی وہ واقعات اچھی طرح یاد ہیں جو ہمارے پہلی بار پاکستان آنے پر پیش آئے تھے۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ میں اور میرے شوہر سوات جا رہے تھے۔ دوپہر کو کھانے کے بعد ہم نے سوچا کہ منگورہ شہر کا نظارہ کیا جائے۔ لہٰذا ہم نے رکشا لیا اور سیر کو نکل پڑے ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ بے شمار لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان میں سے چند ایک نے تو رکشا کے پردے بھی اٹھا کر اندر جھانکنا شروع کر دیا چنانچہ ہم نے فوراً واپسی کا فیصلہ کیا اور رکشہ چھوڑ کر ہوٹل چلے گئے۔ میرے خیال میں اس موقع پر انسان کو اپنی ترجیحات کا خیال کرنا چاہیے۔ ان مواقع پر آسانی سے دوسرں کے جذبات کو بے قابو کیا جا سکتا ہے البتہ انسان کے ہاتھوں سے اچھی باتوں کا دامن نکل جاتا ہے۔

س: آپ اپنی بچیوں کو پاکستان یا ہالینڈ میں کس جگہ مستقل طور پر آباد دیکھنا پسند کریں گی؟

ج: میں چاہوں گی کہ میری بچیوں کی زندگی پاکستان ہی میں بسر ہو کیونکہ وہ بہر حال پاکستانی ہیں اور یہیں انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا ہے ان کے پس منظر اور تعلیم کے باعث میرا یقین ہے کہ انہیں دونوں تہذیبوں کے بہترین اوصاف میسر آئے ہیں ایک اور بات جو نسبتاً زیادہ اہم ہے انہیں نہ صرف فوراً اپنے ماحول بلکہ دنیا بھر کے حالات سے اچھی طرح آگاہ کیا جائے کیونکہ میرے خیال میں دوسرں کے خیالات اور سمجھنے پر آمادگی اور اس حقیقت سے باخبری ہی دنیا کو ایک عالمگیر جنگ سے محفوظ کر سکتی ہے۔

س: ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ قرآن پاک ''ڈچ'' زبان میں ترجمہ کر رہی ہیں اب تک آپ نے اس ضمن میں کتنا کام مکمل کر لیا ہے؟

ج: مجھے معلوم نہیں کہ آپ نے یہ معلومات کہاں سے حاصل کر لی ہیں۔ مگر میرے خیال میں اس بارے میں کچھ غلط فہمی موجود ہے میں اتنا مشکل کام بھلا کیسے کر سکتی ہوں۔ میں نے جو کام شروع کیا وہ محض یہ ہے کہ تمام سورتوں کو مختلف مضامین کے تحت یک جا کر دیا جائے تا کہ جب بھی ضرورت ہو تو تمام سورتیں میسر آسکیں۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے عام طور پر میں نے جو انڈکس دیکھے وہ مجھے مکمل محسوس نہیں ہوئے چنانچہ میں نے انہیں مکمل کرنے کا کام شروع کیا۔ اب اپنی تیار کردہ فہرست سے باآسانی متعلقہ سورتیں اور پیراگراف حاصل کر سکتی ہوں۔ یہ کام ابھی مکمل نہیں ہوا۔ لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن میں نہ صرف یہ فہرست اور انڈکس بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اضافی نوٹ وغیرہ کا کام بھی مکمل کر لوں گی۔

س: پاکستان، یہاں کے عوام اور سیاست کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: پاکستان ایک خوبصورت ملک ہے جس میں ترقی کے لئے بے پناہ توانائیاں اور صلاحیتیں موجود ہیں، بہت سے کام ایسے کئے جا سکتے ہیں جن کے لئے روپے پیسے کی ضرورت نہیں۔ مگر جن سے بے پناہ فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں سب سے پہلا اور مقدم تو صفائی کا مسئلہ ہے۔ اس پہلو پر مذہبی اعتبار سے بے حد زور دیا گیا ہے لیکن اسے روزمرہ زندگی میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے مارکیٹ اور رہائشی علاقے

یکساں طور پر ایسی جگہیں ہیں جہاں مکھیاں بلا امتیاز گندگی پھیلاتی ہیں۔ میونسپل ادارے اس ضمن میں اپنے طور پر کوشش کرتے ہیں مگر اس ضمن میں عوام کو سمجھانے اور تعلیم دینے کی ضرورت ہے ملاوٹ ایک اور مسئلہ ہے ہر شے میں خاص طور پر خوردنی اشیاء میں ملاوٹ کی جاتی ہے یہ انسانی جانوں سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ صرف سخت کنٹرول اور سنگین سزاؤں کے ذریعے میرے خیال میں اس مسئلہ کو حل کیا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے کوالٹی کنٹرول بھی ضرور ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ اگر آپ کسی غیر کا سمیٹکس کا ایک آئٹم خریدیں جو مقامی طور تیار کیا گیا ہے تو آپ کو غیر ملک سے خریدے گئے اس آئٹم کے اعتبار سے اس کی قیمت میں تو کمی محسوس نہیں ہوگی۔ لیکن معیار میں بے پناہ فرق ہوگا۔ اسی طرح ٹریفک کا برا حال ہے اگرچہ قانون ہے لیکن کوئی شخص اس کی پابندی نہیں کرتا ہزاروں لوگ حادثات میں ناگہانی طور مر جاتے ہیں۔ اگر ٹریفک کے اصولوں کو سختی سے نافذ کیا جائے تو اس پر کچھ خرچ نہیں آیا۔ بلکہ جرمانے کی شکل میں اس سے قومی خزانے میں خاصی رقم جمع ہو سکتی ہے۔ ڈرائیونگ ٹسٹ باقاعدگی سے ہونے چاہیں اور ڈرائیونگ لائسنس کے اجراء پر سخت کنٹرول ہونا چاہیے۔ ٹریفک پولیس کو بہتر طور پر تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ جب کوئی غلط حرکت کرے یا قانون کی خلاف ورزی کرے تو انہیں اس سے سختی سے نمٹنا چاہیے بجائے اس کے کہ وہ چوراہے پر کھڑے ہو جائیں۔ یا ٹریفک کو ایسے اشارے کرتے رہیں جس سے یہ (ٹریفک) اور زیادہ مشکلات کا شکار ہو جائے۔ پی ڈبلیو ڈی (محکمہ تعمیرات) کے کارکن الگ مثال ہیں۔ پانی میں پائپ اکثر رستے رہتے ہیں۔ اور یوں قیمتی پانی کا بڑا حصہ سڑک پر بہہ کر ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اس سلسلہ میں واقعی کچھ کرنا چاہے تو پھر پی ڈبلیو ڈی کے مزدور درختوں تلے سوئے نظر نہیں آئیں گے۔ یہ باتیں بظاہر چھوٹی چھوٹی ہیں مگر ان سے ملک کا حسن کجلا جاتا ہے۔ اور ان سے بہت سی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ایک بات جس سے مجھ جیسے غیر ملکیوں کو خاصی پریشانی اور کوفت ہوتی ہے یہ ہے کہ اخبارات میں عالمی خبریں سرے سے موجود ہی نہیں ہوتیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا بس پاکستان پر ہی مشتمل ہے ہم خود کو ساری دنیا سے بالکل کٹا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اگر سرکاری اخبارات عالمی امور کی جانب زیادہ توجہ دیں تو اس سے ملک کے وقار میں اضافہ ہوگا۔ جہاں تک پاکستان کے عوام کا تعلق ہے مجموعی طور پر انہیں دوست اور مہمان نواز پایا ہے۔ بعض اوقات بیوروکریسی سے کام کرانا مشکل ہو جاتا ہے اور سارا دن انتظار کے بعد اگلے روز آنے کا وعدہ دے دیا جاتا ہے۔ اپنے شوہر کی حیثیت کی وجہ سے ہمیں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ سماجی اعتبار سے وہ (میرے شوہر) بڑے غیر رسمی واقع ہوئے ہیں۔ اور انہیں جتنے دعوت نامے موصل ہوتے ہیں۔ ان سب کے مطابق حاضری دینا سچی بات تو یہ ہے کہ فل ٹائم جاب ہے۔

جہاں تک سیاست کا تعلق ہے یہ ایک ایسا موضوع ہے جس میں میں نے کبھی دلچسپی نہیں لی اور میرے نہایت مختصر اور محدود نظریات ہیں تاہم میں یہ ضرور کہوں گی۔ کہ معذور لوگوں اور خاص طور پر بچوں کے مسائل سے عوام کو باخبر کرنے کا سہرا صدر ضیاء الحق کے سر ہے اگرچہ اس شعبہ میں ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خاصا کام کیا جا چکا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اب تک یہ سب کچھ گداگری کے بارے میں نہیں کیا جاسکا۔ اب تک جس قدر زکوۃ جمع یا حاصل کی جا چکی ہے۔ اس سے گداگری کا یقینی طور پر خاتمہ کیا جانا چاہیے تھا۔

خاص طور پر جب لوگ غیر ملکیوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں تو اس سے ملکی وقار کو بڑا دھچکہ لگتا ہے۔

س: کیا آپ نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر خان نے آپ سے کوئی اہم بات یا راز چھپائے رکھا ہے؟

ج: جی نہیں! کبھی نہیں ہوا اور میرا خیال ہے کہ ۲۲ سال کی رفاقت اب اس قدر گہری ہے کہ اب ایسی بات سوچی ہی نہیں جا سکتی۔

س: اگر آپ کو دوبارہ زندگی ملے تو کیا آپ پھر بھی ڈاکٹر خان کو جیون ساتھی بنانا پسند کریں گی؟

ج: اس سوال کے جواب میں میں "نہ" کرنے کی ہمت نہیں کرتی کیونکہ خدشہ ہے کہ پھر وہ مجھے چھوڑ ہی دیں۔ خیر یہ تو میں مذاقاً کہہ رہی تھی۔ ویسے میں سنجیدگی سے بتاؤں کہ ان (ڈاکٹر خان) سے شادی کر کے کبھی پچھتائی اور نہ مجھے اس پر معذرت خواہ ہونا پڑا۔ اور میرے شوہر ایک عظیم انسان ہیں لیکن میں اس نظریہ پر یقین نہیں رکھتی کہ ساری دنیا میں ہر کسی کے لئے بس ایک ہی موزوں جیون ساتھی ہوتا ہے اگر اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو دوبارہ زندگی ملنے پر (اگر ممکن ہوا تو) میرا جیون ساتھی کوئی اور ہو سکتا ہے اور اسی طرح ان کا بھی۔

س: آپ شاید یورینیم کی افزودگی جیسے ٹیکنیکل امور کے بارے میں بھی معلومات رکھتی ہیں۔ جب آپ کو بھی معلوم ہوا کہ پاکستان نے اس میدان میں دنیا کی اجارہ داری ختم کر دی تو آپ کا کیا ردعمل تھا؟

ج: جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ میرے شوہر مجھے ہر بات بتاتے ہیں لہذا میں پورے وثوق سے اور اعتماد سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں ان چند پہلے لوگوں میں سے ہوں جنہیں علم ہو گیا تھا کہ پاکستان نے یورینیم کی افزودگی میں مغرب کی اجارہ داری ختم کر دی ہے میں اس ٹیکنیکل کامیابی کی دل کھول کر تعریف کرتی ہوں۔ میرے واسطے یہ امر بھی مسرت کا باعث تھا کہ اس طرح میرے شوہر نے اپنے وطن واپس آنے کا بڑا مقصد حل کر لیا تھا۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ کسی عظیم کارنامہ کی کامیابی پر شگفتگی کے تاثرات اور جذبات کیسے ہوتے ہیں۔ اور یہ بلاشبہ میرے شوہر اور ان کے ساتھیوں کو پاکستان کی ایٹمی تاریخ لکھنے پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

س: کیا آپ کو کبھی کہوٹہ جانے کا اتفاق ہوا؟

ج: میں پاکستانی شہری ہوں اور اس حیثیت سے کہوٹہ میری پہنچ سے باہر نہیں اور میں کئی بار اس علاقہ میں گئی ہوں حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے اس جگہ کو ابتدائی مرحلہ پر بھی دیکھا جب ابھی وہاں عمارات کی تعمیر سے پہلے زمین کو ہموار کرنے کا کام کیا جا رہا تھا۔ اس وقت ہم وہاں آم کے بڑے تناور اور گھنے سایہ دینے والے درخت کی تعریف کیا کرتے تھے۔ یہ درخت اب بھی موجود ہے اور اس سے ہر سال لذیذ آم اتارے جاتے ہیں البتہ اس درخت کے اردگرد کا ماحول خاصی حد تک بدل گیا ہے۔ میں اس ساری ٹیم کو جانتی ہوں جس نے ابتدائی کام کیا اور یہ ٹیم انتہائی ماہر اور ایثار کرنے والے سائنسدانوں اور انجنیئروں پر مشتمل ہے۔

س: غیر ملکی اخبارات اور رسائل یہ پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان ایٹم بم بنا رہا ہے اور یہ نام نہاد اسلامی بم آپ کے شوہر نے تیار کیا ہے، کیا آپ اس پر تبصرہ کرنا پسند کریں گی؟

ج: اب ہم ایسے بے بنیاد اور شر انگیز پروپیگنڈوں کے عادی ہو گئے ہیں جو عام طور پر پاکستان اور خاص طور پر میرے شوہر کے خلاف کیا

جاتا ہے۔ پاکستان کے صدر، وزیر اعظم اور دیگر ذمہ دار حکام متعدد بار واضح طور پر کہہ چکے ہیں کہ پاکستان نہ تو کوئی ایٹمی ہتھیار بنا رہا ہے اور نہ ہی دلچسپی رکھتا ہے اس کا پروگرام صرف ملک کی توانائی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے ہے، وہ (غیر ملکی اخبارات) میرے شوہر پر برستے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس بات کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ پاکستان اس مشکل اور پیچیدہ ٹیکنالوجی میں مغرب کی اجارہ داری کو ختم کردے گا۔ افزودگی کی ٹیکنالوجی میں مہارت اور دسترس نے اس اہم میدان میں ترقی کے لئے ایسی نئی سمتیں اور افق کھول دیئے ہیں۔ جن کا خیال ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک عام آدمی پاکستان کے لئے اس کام کے اثرات کا تصور نہیں کرسکتا۔

س: آپ کے خیال میں پاکستان کو ایٹم بم تیار کرنا چاہئے یا نہیں؟

ج: یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب آپ جیسا باخبر اور تجربہ کار صحافی بہتر طور پر دے سکتا ہے۔ اور پھر ایسے فیصلوں کا انحصار سیاسی راہنماؤں پر ہوتا ہے کیونکہ یہ خالصتاً سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں جاندار چیزوں کو ختم کرنے والی یا نقصان پہنچانے والی ہر طرح کی جنگ کے خلاف ہوں۔ تاہم اگر پاکستان کی حکومت کسی مرحلہ پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایٹم بم اس ملک کی بقاء اور یکجہتی اور خودمختاری کیلئے لازمی ہے تو اس کو تیار کرنے میں حق بجانب ہوگی کیونکہ امریکہ، فرانس، برطانیہ، روس اور چین نے بھی تو اپنے اپنے ملکوں کے تحفظ کے لئے قدم اٹھایا ہے۔ صرف بھارتیوں نے یہ کہہ کر دنیا کو دھوکہ دیا کہ ''پرامن ایٹمی دھماکہ'' بھی کوئی شے ہوتی ہے۔ مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ اگر کبھی بھی حکومت پاکستان نے میرے شوہر اور ان کے ساتھیوں کو یہ (بم تیار کرنے کا) کام ملکی مفادات کے لئے کہا تو میرے شوہر اور ان کے ساتھی قوم کو مایوس نہیں کریں گے۔ یہ ٹیم ایسے اعلیٰ ماہر اور مخلص سائنسدانوں اور انجینیئروں پر مشتمل ہے جو کامیابی حاصل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

میں انٹرویو کے آخر میں چند ایسے ذاتی خیالات کا اظہار بھی کرنا چاہوں گی جو آپ کی طرف سے پوچھے گئے سوالات کے سیاق و سباق میں گفتگو کے احاطہ میں نہیں آئے۔

میں جانتی ہوں کہ میرے شوہر کی مقامی اخبارات و رسائل میں بے حد تعریف کی جاتی ہے میں نے پڑھا ہے کہ ان کو انتہائی قدر و منزلت دی جاتی ہے۔ اور وہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ میں یکساں طور پر پسند کئے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ نے پاکستان بنایا اور میرے شوہر نے سخت محنت ایثار اور افزودگی کی مشکل اور پیچیدہ ٹیکنالوجی میں اپنی مہارت کے ذریعے اس ملک کی ہمیشہ کے لئے بقاء، سلامتی اور یکجہتی کی ضمانت فراہم کردی ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ میرے شوہر کا نام پاکستان کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ انہوں نے ملک کو مضبوط بنانے کیلئے جو خدمات انجام دی ہیں۔ اس لئے پاکستانیوں کو ان پر فخر ہے پاکستانی ان کے شکر گذار ہیں۔ پاکستانی ان کو کبھی بھی فراموش نہیں کریں گے اور بھی بے شمار باتیں! تعریفی کلمات سے یہ ظاہر ہے کہ مجھے اور میری بچیوں کو قدرتی طور پر طمانیت ہوتی ہے لیکن میں ذاتی طور پر اس تعریف کے اخلاص کے بارے میں شکوک کا شکار ہوں جب اس پراجیکٹ کا آغاز ہوا تو بہت سے سائنسدانوں اور انجینئروں نے مرکز گریز طریقے سے افزودگی کی ٹیکنالوجی کا نام بھی نہیں سنا تھا اس کے لئے انہیں الزام نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن بہت سے لوگوں نے اس پراجیکٹ کو ایک ناممکن کام اور عوام کے

سرمایہ کا ضیاع قرار دینا شروع کر دیا۔ اب جب کہ یہ بہت عظیم کام مکمل ہو چکا ہے، کہوٹہ کے نام سے پاکستان کے دشمنوں کو کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور ٹیکنالوجی کے نقطہ نظر سے اس نے پاکستان کی توقیر میں اضافہ کیا ہے، تو بہت سی گمنام آوازیں آنے لگی ہیں جن میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہم نے پراجیکٹ کے لئے یہ کیا ہم نے وہ کیا۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ پراجیکٹ ہم نے ہی چلایا۔ مجھے یہ سب کچھ بہت عجیب وغریب محسوس ہوتا ہے۔ یہ نہ صرف میرے شوہر بلکہ ان تمام سائنسدانوں کی دن رات کی محنت، جدوجہد اور کامیابیوں پر پانی پھیرنے کے مترادف ہے جنہوں نے حقیقتاً اس پراجیکٹ پر دن رات کام کیا اور اسے کم مدت میں مکمل کیا۔ یہ دوسرے سائنسدان اب کیا کر رہے ہیں۔ ان کی نام نہاد کامیابیاں اب کہاں ہیں؟ اگرچہ اخبارات اور رسائل میں ذکر اور چرچا میرے نزدیک اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا کوئی دوسرا شخص تصور کر سکتا ہے۔ لیکن مجھے اصل خوشی اس بات کی ہے کہ میرے شوہر نے جو مقصد پیش نظر رکھا اسے نہ صرف حاصل کر لیا بلکہ بے پناہ مشکلات کے باوجود حاصل کیا یہ مشکلات کتنی ہوتی تھیں اس کا علم صرف حکومت میرے شوہر کے ساتھ کام کرنے والوں اور ہمیں ہے۔ مجھے توقع ہے ایک دن تمام حقائق ضرور منظر عام پر آئیں گے کہ ہر شخص ان سے آگاہ ہو سکے۔ آپ مجھے یہاں چند مثالیں دینے کی اجازت دیجئے۔

۱۹۷۶ میں جب پراجیکٹ شروع ہوا تو یہ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کا ایک حصہ تھا۔ چند ماہ ادھر ادھر پھرنے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ موجودہ حالات کے تحت کوئی کام ممکن نہیں بس ایسے میں دو راستے ہی کھلے ہوئے تھے۔ ایک یہ کہ سب کچھ ختم کر کے اسے چھوڑ دیا جائے اور دوسرا یہ کہ حکومت کو اصل صورت حال سے مطلع کر کے بہترین نتائج کی توقع وابستہ کی جائے اپنے اس دوسرے انتخاب کے تحت حکومت نے سارے ایٹمی پروگرام کی سربراہی کے لئے ڈاکٹر امیر محمد خان کی اہلیت کے بارے میں جاننا چاہا۔ اس سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوگئی۔ میرے شوہر پندرہ سال تک ملک سے باہر رہے تھے۔ وہ ڈاکٹر امیر محمد خان یا منیر احمد خان کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ ڈاکٹر امیر محمد خان بڑے متحرک اور سرگرم شخص تھے۔ مگر حقیقتاً وہ نہ تو ایٹمی سائنسدان تھے اور نہ ہی ایٹمی انجینئر تھے۔ ڈاکٹر خان نے تجویز کیا کہ کہوٹہ پراجیکٹ کو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار بنا دیا جائے جسے حکومت نے خوش قسمتی سے منظور کر لیا۔ اور اس کے نتائج آپ سب کو بخوبی معلوم ہیں۔

ایک اور پریشان کن صورت حال اس وقت سامنے آئی جب میرے شوہر کے مقدمہ کیخلاف اپیل کی سماعت ان کی غیر حاضری میں جاری تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے اس مقدمہ کو ایک قانونی مقدمہ کی بجائے ذاتی توہین تصور کیا۔ انہوں نے اپنی ذہنی وجسمانی صحت کی پرواہ کئے بغیر دن رات محنت کی تاکہ اس غیر متوقع مقدمہ سے اپنا نام خارج کرا سکیں۔ جب وہ اپنے وکلاء کے لئے اپنا دفاع کا کیس تیار کر رہے تھے تو انہیں اس مضمون (آرٹیکل) کی فوٹو کاپی کی ضرورت پڑی جو ۱۹۶۲ء میں ہالینڈ سے شائع ہونے والے "فلپس ٹیکنکل ریویو" میں شائع ہوا تھا۔ اس آرٹیکل میں ہو بہو وہی اطلاعات اور معلومات تھیں جنہیں سرکاری وکیل نے "مخصوص معلومات" قرار دیا تھا اور جن کے حاصل کرنے پر میرے شوہر پر الزام عائد کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ "پنسٹک" کی لائبریری میں موجود تھا۔ اور ڈاکٹر خان نے اپنے ایک ساتھی (جو پنسٹک کے سابق سائنسدان بھی تھے) سے کہا کہ وہ اس کی فوٹو کاپی حاصل کر لیں۔ لیکن ہمیں یہ جان کر بے حد دکھ اور حیرت ہوئی کہ پنسٹک کے ڈائریکٹر ڈاکٹر نعیم احمد خان نے یہ کہہ کر متعلقہ مضمون کی فوٹو کاپی دینے سے انکار کر دیا کہ انہیں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین منیر احمد خان اور ممبر ٹیکنالوجی ڈاکٹر اشفاق احمد نے ڈاکٹر

خان کو یا ان کے ساتھیوں کو کسی قسم کا لٹریچر یا اس کی فوٹو کاپی دینے سے منع کر رکھا ہے، یہ جان کر ڈاکٹر خان کی کیا کیفیت ہوئی میں بیان نہیں کر سکتی، میں نے انہیں اسقدر غصے میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سچ مچ کسی شخص کو قتل کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ بہر حال ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر جناب ریاض پراچہ نے فلپس (ہالینڈ) سے اس رسالہ کی ایک کاپی حاصل کر لی۔ میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ ایسا ہو گا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے بس وہ وقت ایک ایسا تھا جب میں نے ڈاکٹر خان سے کہا کہ بس اب ہمیں سامان باندھ کر واپس چلے جانا چاہیے۔

اور اس میں کچھ شک وشبہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر خان نے ایک سائنسدان کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا غیر معمولی مظاہرہ کیا تھا۔ ہمارے یہاں پاکستان آنے سے پہلے ان کو کئی ملکوں سے بڑی اچھی اور پر کشش پیشکشیں انہیں دوبارہ مل سکتی ہیں بہر حال کچھ عرصہ کے بعد ہمارا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا لیکن اس بات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر اس لئے کہ یہ اپنے ہی اہل وطن کا کیا دھرا تھا۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر خان کی اپیل کا فیصلہ ان کے حق میں ہوا۔ اور مقدمہ جیت گئے اور میرا یہ اصرار بھی خود بخود ختم ہو گیا کہ پاکستان اپنے مسائل میرے شوہر کے بغیر خود ہی حل کرے۔ لیکن میرے یہ تاثرات ابھی بھی ختم نہیں ہوئے کہ منہ پر کی جانے والی تعریفوں کی کوئی اہمیت نہیں۔

اداروں کا کردار

کہوٹہ دشمن لابی نے ڈاکٹر خان اور انکے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ افواج پاکستان کے اداروں کو بھی نہیں بخشا۔ حالانکہ ان کی تعریف دنیا بھر میں کی گئی ہے۔ 2010 میں برطانیہ میں پوری دنیا کی فوجوں کی جنگی مشقیں ہوئیں اور ہمارے لئے یہ بات قابل فخر ہے کہ افواج پاکستان وہاں پہلے نمبر پر آئی ہیں۔ پوری دنیا نے پاکستان کو دُنیا کی نمبرون افواج قرار دیا ہے۔

قارئین کرام! ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ قیام پاکستان سے لیکر اب تک جن اداروں نے وطن عزیز کے لئے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ صرف دو ادارے ہی ہیں۔

اوّل: افواج پاکستان

دوم: کے آر ایل

آپ اس کتاب کے پہلے باب میں کہوٹہ دشمن لابی کی طرف سے لگائے گئے الزامات کا تذکرہ پڑھ چکے ہیں یہاں میں صرف انکا جواب دینے پر ہی اکتفا کروں گا۔

یہ ہمارے خفیہ اداروں ہی کا اعجاز ہے کہ انہوں نے ایٹمی پلانٹ کے لئے درکار سامان کی خریداری کا کسی کو علم ہی نہ ہونے دیا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ پوری دنیا آئی ایس آئی کی افغان وار میں روس کے خلاف حکمت عملی دیکھ کر اس کی مستعدی ذہانت اور بہادری کی قائل ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل حقیقت لیکن آپ سے میں یہ بھی عرض کروں کہ کہوٹہ پلانٹ کو آئی ایس آئی نے جس طرح دشمن کی نظروں سے بچا کر رکھا ہے اس کی وجہ سے آج پوری دنیا حیران ہے۔ یہاں میں کہوٹہ دشمن لابی کے اس الزام کا بھی جواب دیتا ہوں جو جنرل حمید گل کے حوالے سے ڈاکٹر خان کی شخصیت پر عائد کیا گیا ہے (دیکھئے باب اوّل کہوٹہ دشمن لابی کے الزامات) حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے آج تک کوئی رپورٹ ڈاکٹر خان کے خلاف کسی کو نہیں دی۔ نہ

ہی ان کے پاس کوئی ایسی رپورٹ تھی۔ تاہم انہی کے الفاظ میں آپ کو جواب دینا چاہوں گا۔ جنرل صاحب فرماتے ہیں کہ ''میں نے دراصل وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کو کہوٹہ اور ڈاکٹر خان کے روٹ کی سیکورٹی کے حوالے سے فائل پیش کی تھی۔ جس میں سیکورٹی کے کچھ نقائص درج تھے۔ باقی یہ جو میرے حوالے سے کہا جا رہا ہے کہ میں نے بے نظیر کو ڈاکٹر خان کی منفی رپورٹ دی۔ یہ بالکل بے بنیاد، من گھڑت اور فضول بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر خان ہمارے عظیم ہیرو ہیں۔ مجھے یہ ماننے میں کوئی عار نہیں کہ اگر ڈاکٹر خان نہ ہوتے تو آج پاکستان کبھی ایٹمی طاقت نہیں بن سکتا تھا۔''

ہمارے اداروں نے کے آر ایل کا جس طرح دفاع کیا اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ اندازہ لگائیں کے اس پروگرام کی ابتداء سے لیکر تکمیل تک ہر ادارے خواہ وہ حکومتی ہوں یا فوجی انہوں نے اسکا ساتھ دیا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہر حکومت نے اپنے آپس کے اختلافات کے باوجود کہوٹہ پراجیکٹ پر کبھی آنچ نہیں آنے دی اور نہ ہی اسے کسی بھی چیز کی کوئی کمی محسوس ہونے دی گئی ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں۔ ایٹمی دھماکوں کے وقت بھی جب میاں نواز شریف کی حکومت تھی ہر پارٹی نے ایٹمی دھماکوں کے حق میں ہی رائے دی تھی۔

یہ 29 مارچ 1994 کی بات ہے اس وقت کے آرمی چیف جنرل عبد الوحید کاکڑ ان دنوں امریکہ کے دس روزہ دورے پر گئے ہوئے تھے۔ اس دوران جب امریکیوں نے حسب روایت واشنگٹن میں جنرل کاکڑ سے ایٹمی پروگرام کے متعلق کوئی بات کرنا چاہی تو انہوں نے انہیں برملا کہا ''پاکستان کا ایٹمی پروگرام سودے بازے کے لئے استعمال نہیں کیا جائیگا۔ ہم وقار اور مفادات کو قربان کر کے ایف 16 طیارے یا کوئی اور چیز خریدنے میں دلچسپی نہیں رکھتے میں ایک ہی سیدھی بات کرتا ہوں کہ کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ پاکستان کے مزار کا کتبہ لکھے''

ڈاکٹر خان نے بھی ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ''ایٹمی پروگرام کے حوالے سے تمام آرمی چیفس نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا لیکن جب پروگرام کے آخر میں امریکیوں کو یقین ہو گیا کہ پاکستان جوہری صلاحیت حاصل کر چکا ہے تو انہوں نے کچھ زیادہ ہی دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اسی دوران جنرل وحید کاکڑ اور جنرل اسلم بیگ نے جس طرح ان کے سامنے سخت موقف اپنایا اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے''

پراجیکٹ ڈائریکٹر یاور کر

محسن پاکستان کے مختلف رفقائے کار کے ساتھ میری طویل نشستیں ہوئیں ہیں۔ ان ملاقاتوں میں حاصل ہونے والے ان کا تاثرات اور تجربات مختصراً عرض کرتا ہوں۔ ڈاکٹر خان کے رفقاء کے مطابق جس وقت کے آر ایل کا منصوبہ شروع ہوا تھا اس وقت صورتحال صفر تھی۔ ڈاکٹر خان نے اس کے لئے ایسے نوجوان سائنسدانوں اور انجینئر ز کا انتخاب کیا جو واقعی محنت، انتھک اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار تھے۔ انہوں نے کئی دوسرے اداروں سے بھی ایسے افراد کا انتخاب کیا جن کی صلاحیتیں وہاں ضائع ہو رہی تھیں۔ اور ان میں کام کرنے کا جذبہ ماند پڑھ گیا تھا۔ انہوں نے ایسے سائنسدانوں اور انجنیئر وں کو بھی چنا جو دیار غیر میں پڑھ یا کام کر رہے تھے۔ لیکن وطن عزیز کی خدمت کے لئے واپس بھی آنا چاہتے تھے انہوں نے فضائیہ اور آرمی سے بھی اعلٰی صلاحیتوں کے مالک افراد کو منتخب کر کے اس عظیم منصوبے کو پروان چڑھایا۔ ڈاکٹر خان کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے پاس سائنسدانوں اور انجنیئر وں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی۔ جو بے انتہاء قابل محنتی ہونے کے علاوہ کچھ کر کے دکھانے کے لئے پر عزم بھی تھی۔

ڈاکٹر نذیر احمد بتاتے ہیں کہ ''ڈاکٹر خان نے یہ ذمہ داری قبول کرنے کے ساتھ ہی خود پر دن کا چین اور رات کا سکون حرام کر لیا تھا۔

انہوں نے پہلی توجہ اس منصوبے کی تنظیم نو پر دی اور بیرون ملک سے ضروری پرزہ جات منگوائے۔ جو پرزہ جات مقامی طور پر بنائے جانے تھے ان کی تیاری کا کام بھی بیک وقت شروع کر دیا۔ مقامی طور پر ہی انہوں نے بہت سے اداروں سے تعاون حاصل کیا۔ ہماری کامیابی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم سب ایک ٹیم کی طرح کام کرتے تھے، ایک دوسرے کے معاون بن کر۔ ہمارے لئے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر خان رات کے دو بجے تک ہمارے ساتھ مصروف رہتے تھے۔ اور ان کے کام کرنے کا انداز تو نہایت دلکش تھا۔ وہ ایک ماہر سائنسدان اور میٹالرجسٹ ہیں۔ لیکن انہوں نے کبھی کسی پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی بجائے ہر کسی کو کھلا کام کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ پوری ٹیم کو ساتھ لیکر چلتے۔ اور دلچسپی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی ساتھی کا غلط مشورہ بھی رد نہیں کیا بلکہ وہ باتوں باتوں میں درست سمت کی رہنمائی فرما دیتے۔ ایک مرتبہ ایک نہایت اہم پرزہ کے لئے بعض ایسی چیزیں استعمال کرنا چاہیں جو نا قابل عمل تھیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے انہیں ان کی مرضی سے کام کرنے کی اجازت دی۔ پھر جب وہ ناکام رہے تو انہوں نے نہایت نرمی سے پرزہ کی تیاری میں درست سمت میں رہنمائی کی۔ اور ہمیں اس وقت عجیب خوشی ہوتی جب ڈاکٹر خان گھنٹوں ہمارے ساتھ کھڑے رہتے اور ہمارا کام دیکھتے اگر کوئی پرزہ فٹ کرنا ہوتا تو خود آگے بڑھ کے کر دیتے اور ہمیں یہ اندازہ کرنا نہایت مشکل ہوتا تھا کہ وہ پراجیکٹ ڈائریکٹر ہے یا عام ورکر!

کے آر ایل کا کریڈیٹ

ڈاکٹر خان کی سربراہی میں کے آر ایل نے ایٹم بم اور غوری میزائل کے علاوہ قوم کے دفاع کے اور بھی بہت سے سامان پیدا کئے ہیں۔ جس پر پوری قوم کو بجا طور پر فخر ہے۔ یورپ، ہندو اور یہودی لابی ڈاکٹر خان اور ان کے ساتھیوں کی انہیں محنتوں کی وجہ سے پیچ پا ہیں کہ آخر ایک اسلامی ملک کیونکر اس صلاحیتوں کا حامل بن گیا، آیئے ڈاکٹر خان اور ان کے ساتھیوں نے قوم کے دفاع کے لئے جو دیگر سامان پیدا کئے ہیں ان کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

1 غوری میزائل!

زمین سے زمین تک مار کرنے والے بیلسٹک میزائل جسے میزائل لانچنگ سسٹم سے چھوڑا جاتا ہے جو ایک ہزار کلو گرام وزنی وار ہیڈ کو 1500 سے 2000 کلومیٹر تک لے جا سکتا ہے۔

2 عنزہ میزائل سیریز

زمین سے فضا میں مار کرنے والا گائیڈڈ میزائل جو آسانی سے منتقل کیا جا سکتا ہے اور اپنے ہدف تک ٹھیک پہنچنے والا لیزر رینج میزائل ہے۔

3 بکتر شکن اینٹی ٹینک میزائل

یہ میزائل شعاعوں کی رینج کے ذریعہ خود پیدا کردہ اور اس فاصلے سے دئے جانے والے اپنے سگنل کے ذریعہ ہدف تک پہنچنے اور جام کئے جانے سے محفوظ رہنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ تین ہزار میٹر کے فاصلے سے ہر قسم کے ٹینک کو تباہ کر سکتا ہے۔

4 بارودی سرنگیں صاف کرنے والے مائین چارجر

تین مختلف رینج کے ان چار جروں کو راکٹ لانچر کے ذریعہ سے بارودی سرنگوں کے کسی بھی علاقے میں بارودی سرنگیں صاف کرنے کے لئے پھینکا جاتا ہے چند سیکنڈ بعد فاصلاتی برقی ذرات کے ذریعے ڈیٹونٹ کیا جاتا ہے اوران کی بدولت فوجی اس علاقے سے بحفاظت گزر جاتے ہیں۔

5 ملٹی بیرل راکٹ لانچر

132.4 ملی میٹر قطر کے لانچر جو 25 کلومیٹر تک مار کر سکتے ہیں

6 لیزر رینج فائیڈر

اندھیرے میں بیس کلومیٹر کے فاصلے تک دشمن کی نقل وحرکت کا ٹھیک ٹھیک تعین کرنے اور سراغ لگانے کا بہترین آلہ ہے۔

7 کیمیائی توانائی پرمبنی بکتر بند گاڑی

یہ انتہائی جدید قسم کے ہتھیاروں کا موثر مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

شکنجہ

شکنجہ ناول پاکستان میں ہونے والی تخریب کاری کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ہمارے ہاں گذشتہ کچھ سال سے ”ٹریک ٹو ڈپلومیسی“ کا غلغلہ کچھ زیادہ ہی زور شور سے مچایا جارہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ محبتوں کے جو زنگ آلود دروازے حکومتیں نہیں کھول سکیں وہ شاید عوام بلکہ عوام بھی نہیں دانشور خواتین وحضرات اپنی مساعی سے کھولنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

لیکن......اس ٹریک ڈپلومیسی کی آڑ میں کیا گھناؤنا کھیل رچایا جارہا ہے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں ”بھولے بادشاہوں“ کو کس کس طرح اپنے جال میں پھانستی ہیں اوران سے کیا کام لیا جاتا ہے۔یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

ایک اور بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ پاکستان اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعے کی ذمہ داری ”را“ پر ڈال دیتا ہے۔ یہ بات کس حد تک سچ ہے؟ کس حد تک جھوٹ؟ شاید ان سوالات کے جواب بھی آپ کو اس ناول کے مطالعے سے مل جائیں۔ محبتوں کی آڑ میں منافقتوں کا دھندہ کون چلا رہا ہے؟ دشمن کی سازش کیسے انجام پاتی ہے اوراس سازش کا شکار ہم انجانے میں کیسے بن جاتے ہیں میں نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول کتاب گھر کے **ایکشن ایڈونچر جاسوسی** سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

باب چہارم

غوری میزائل

1۔ میزائل ٹیکنالوجی

2۔ غوری میدان مقتل میں

3۔ غوری میزائل جی ٹی روڈ پر

4۔ حکم کا منتظر غوری

5۔ غوری کے معماروں کی آمد

6۔ غوری پاک فضاؤں میں

غوری میزائل

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

میزائل ٹیکنالوجی

قارئین کرام! میزائل ٹیکنالوجی انتہائی پیچیدہ اور حساس ٹیکنالوجی ہے پاکستان میں دوطرح کے میزائل تیار ہوئے ہیں۔

۱۔ سالڈ فیولڈ میزائل

۲۔ لیکوئڈ فیولڈ میزائل

کمیشن کے ذمہ داران کا کہنا ہے کہ ہم نے سالڈ فیولڈ میزائل بنایا ہے جبکہ کے آر ایل نے لیکوئڈ فیولڈ میزائل بنائے ہیں آپ کی رہنمائی کیلئے سالڈ فیولڈ اور لیکوئڈ فیولڈ کے اوپر مختصری معلومات پیش خدمت ہیں۔ آپ اس سے یہ اندازہ بھی لگا پائیں گے کہ سالڈ فیولڈ سے لیکوئڈ فیولڈ ٹیکنالوجی ہزار درجے بہتر ہے۔ جسکی مثال: غوری، غزنوی، شاہین، عنزہ اور دیگر میزائلوں کی صورت میں آپ کے سامنے ہیں۔ گو کہ یہ معلومات سمجھنے میں تھوڑی مشکل ہیں لیکن نیوکلیئر ٹیکنالوجی سے وابستہ طالبعلم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں آیئے ذرا سالڈ اور لیکوئڈ فیولڈ ٹیکنالوجی کا موازنہ کریں۔

کیمائی پراپیلنٹس

پراپیلنٹس کی بنیادی طور پر تین اقسام ہوتی ہیں۔

ٹھوس مائع اور ہائی برڈ لیکن ہم پہلی دو بحث کریں گے۔ سالڈ پراپیلنٹس (راکٹ اور میزائل کا ایندھن)

تاریخ:

سب سے پہلے راکٹ سینکڑوں برس پہلے چینیوں نے ایجاد کیا۔ جو بنیادی طور پر آتش بازی کے مظاہرے اور ہتھیاروں کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ انکا ایندھن کالا پاؤڈر ہوا کرتا تھا۔ جو کہ بارود کی ایک قسم ہے (چارکول سلفر پوٹاشیم نائٹرٹ کا مجوعہ) راکٹ پراپیلنٹس ٹیکنالوجی نے 19ویں صدی تک خاطر خواہ ترقی نہ کی۔ اسی اثنا میں بے دھواں پاؤڈر دریافت ہو چکا تھا جو شروع میں اسلحہ اور آرٹلری کے لئے استعمال ہوا کرتا تھا بغیر دھویں والے پاؤڈر اور ان سے متعلقہ کمپاونڈ کو ڈبل بیس پراپیلنٹس کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

تعریف:

ٹھوس پراپیلنٹس ایک آکسی ڈائزر پر مشتمل ہوتے ہیں اور ایک ایندھن پر (عام طور پر تمام راکٹ پراپیلنٹس) بارود کے معاملے میں ایندھن چارکول ہوتا ہے۔ جبکہ آکسی ڈائزر پوٹاشیم نائٹریٹ ہوتا ہے اور سلفر بطور کیٹلسٹ کام کرتا ہے (نوٹ: سلفر ایک حقیقی کیٹلسٹ نہیں۔ یہ کافی حد

تک جل جایا کرتا ہے مختلف ردعمل کی صورت میں جیسا کہ K2S۔ سلفر بنیادی طور پر ایک سینسیٹائزر کے طور کام کرتا ہے۔ جسکا کام تھریش ہولڈ اگنیشن کو کم کرنا ہوتا ہے، 1950 اور 1960 کی دہائیوں میں امریکہ کے محققین نے ایجاد کیا، اب ہائی سٹینڈ زڈ انرجی سالڈ راکٹ فیول ہے۔ ایمونیم پرچار کولیٹ کمپوزٹ پراپیلنٹس (AP-CP) محلول بینادی طور پر ایمونیا پر کولیٹ پوڈر (ایک آکسی ڈائز ملایا جاتا ہے) ایلومنیم پوڈر (ایک ایندھن) دونوں کو اکٹھا رکھا جاتا ہے۔ PBAN اور STPB کی بنیاد میں یہ ایک مائع حل بن جاتا ہے اور اس کو پھر ایک صحیح شکل میں ڈھالا جاتا ہے۔ ایک ربڑنما سالڈ کی طرح)

فوائد:

سالڈ فیول راکٹ کو لیکوئیڈ فیول راکٹ کی نسبت ذخیرہ کرنا اور استعمال کرنا آسان ہوتا ہے جو اس کو فوجی استعمال کے لحاظ سے بہت کارآمد بنا دیتا ہے۔ 1970 سے 1980 کی دہائی میں امریکہ نے اپنی تمام راکٹ ٹیکنالوجی کو سالڈ فیول ٹیکنالوجی میں تبدیل کر دیا (LGM-30) اور (LG1188) 80 اور 90 کی دہائی میں روس نے سالڈ فیول ٹیکنالوجی کو فروغ دیا۔ لیکن اس کے ساتھ دو لیکوئیڈ فیول ٹیکنالوجی (ICBMSR-36) اور (UR-100N) کو بھی برقرار رکھا یہ سادہ اور سہل ٹیکنالوجی ہے جس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جب زیادہ مقدار میں راکٹ بنانے ہوں لیکن بجٹ کا مسئلہ ہو تو ان کے انتخاب میں آسانی رہتی ہے۔ اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے اکثر خلائی شٹل اور خلائی مشن پر بھیجی جانے والی خلائی گاڑیوں میں سالڈ فیول ٹیکنالوجی کا استعمال کیا جاتا ہے۔

نقصانات:

اگر سالڈ فیول راکٹ اور لیکوئنڈ فیول راکٹ کا موازنہ کیا جائے تو سالڈ فیول میں بہت ساری خامیاں بھی ہے۔

۱۔ سالڈ راکٹس میں ایک مخصوص ایمپلس ہوتی ہے جو لیکوئیڈ کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔

۲۔ بڑے حجم کے سالڈ فیول راکٹس بنانا مشکل ہوتا ہے کیونکہ راکٹ کا تقریباً 90% حصہ تو ایندھن جلانے والے چیمبر کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

۳۔ سالڈ فیولڈ راکٹس کو اگر مدار میں چھوڑا جائے تو اس کی (PX Load Fraction) بہت کم ہوتی ہے۔

۴۔ سالڈ فیول راکٹس کو مطلوبہ وقت میں تھریش نہیں کیا جا سکتا۔ اگر پراپیلنٹس کی اندرونی ساخت کو تبدیل کیا جائے تو اس کے شیڈول کو طے کیا جا سکتا ہے۔

لیکوئیڈ فیولڈ پراپیلنٹس

تاریخ:

ابتدائی راکٹ ایجاد کرنے والوں نے یہ تھیوری پیش کی کہ لیکوئیڈ آکسیجن بھی ایک راکٹ ایندھن ہے۔ پہلا راکٹ جو رابرٹ گوڈرڈ نے 16 مارچ 1926 میں بنایا تھا اس میں پہلی مرتبہ گیس اور لیکوئیڈ آکسیجن استعمال کی گئی۔ لیکوئیڈ ہائیڈروجن پہلی بار پرٹ اور وائیٹی (دو سائنسدانوں)

کے ڈیزائن کردہ ایجنسیوں میں استعمال ہوئی۔ سب سے زیادہ توانائی جو کسی بھی راکٹ انجن میں استعمال کی گئی وہ لیتھئیم اور فلوربن تھی جس میں ہائیڈروجن کو استعمال کیا گیا تھا۔ تا کہ ''ایگزاسٹ تھرموڈائنامکس'' کو بہتر کیا جاسکے۔ لیتھئیم اور فلوربن دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ جبکہ فلورین اور ہائیڈروفلوربن (HF) بہت زہریلی ہوتی ہیں۔

موجودہ اقسام

عام طور پر استعمال ہونے والے لیکوئیڈ پروپیلنٹس مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ LOX اور کیروسین (RP-1)

۲۔ LOX (لیکوئیڈ ہائیڈروجن)

۳۔ نائٹروجن ٹرائی آکسائیڈ

۴۔ مونو پروپیلنٹس

تاریخ:

تم پراپیلنٹس میں انتہائی مہنگا ہائیڈروکاربن فیول Soguzu2 استعمال ہوتا ہے۔ یہ 1955 تک استعمال کیا جاتا رہا۔

فوائد:

۱۔ لیکوئیڈ فیول مخصوص ایمپلس سالڈ فیولڈ کی نسبت تیز ہوتی ہیں۔

۲۔ اسکو ذخیرہ بھی کیا جاسکتا ہے اور وقت پڑنے پر دوبارہ استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ سالڈ فیولڈ کی یہ خصوصیت صرف دس سال تک ہوتی ہے۔

۳۔ یہ سالڈ فیولڈ کی نسبت انتہائی سستے ہوتے ہیں اور یوں ان کی تیاری میں بھی کم لاگت آتی ہے۔

نقصانات:

۱۔ چونکہ ان میں استعمال کیا جانے والے مواد انتہائی زہریلا ہوتے ہیں اس لئے اسے ذخیرہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔

۲۔ انکی دیکھ بھال کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔

۳۔ ان کی تیاری میں مختلف والوز اور سلیس درکار ہوتی ہیں جو کہ تھرملی سٹریسڈ چیمبرز میں استعمال ہوتی ہیں۔ جس سے ان کی لاگت زیادہ ہوجاتی ہے۔

غوری میدان مقتل میں

تین اپریل کو غوری میزائل کہوٹہ ریسرچ لیباٹریز سے جہلم کے قریب بنے لانچنگ پیڈ پر لے جایا گیا۔ کہوٹہ کی بجائے یہاں غوری میزائل کو فوری آزمانے کا فیصلہ فوجی قیادت نے اچانک کیا تھا۔ اصل میں اسکی کچھ وجوہات تھیں۔ 16 اپریل کو غوری کے لانچ ہونے سے پہلے کہوٹہ ہی میں غوری میزائل کے کئی ایک متعلقہ کامیاب تجربات ہوچکے تھے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کے دیگر رفقاء یہ چاہتے تھے کہ غوری میزائل کہوٹہ ہی سے

فائر کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے کہوٹہ میں غوری لانچ کرنے کے لئے زیرزمین سینکڑوں ٹن سریا دفن کر کے لانچنگ پیڈ بھی بنالیا گیا تھا۔ میزائل کے انجن اور دیگر آلات یہاں ہی ٹیسٹ کیے گئے تھے۔ لیکن جب حتمی پرواز کا وقت آیا تو فوجی حکام نے اس حوالے سے میزائل کی آزمائشی لانچنگ کو کسی اور جگہ کرنے کا فیصلہ کرلیا کہ مبادئی غوری کے ٹیک آف کرنے میں کسی خلل کی وجہ سے یا خدانخواستہ میزائل کے پھٹ جانے کی وجہ سے کہوٹہ میں دیگر تنصیبات کو کوئی نقصان پہنچے۔ اس حوالے سے وہ مکمل چھان بین کے بعد جہلم کے قریب ایک جگہ نتھ والا کو پہلے سے منتخب کر چکے تھے۔ حکومت کے فیصلے کے مطابق پہلے پانچ اپریل کو اس وقت دیو قامت میزائل نے فائر کیا جانا تھا۔ اسی لئے یہ فیصلہ ہوا کہ میزائل کو 3 اپریل تک لانچنگ سائٹ پر لے جایا جائے اور یوں غوری کے سفر کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

ادھر جس علاقے میں لانچنگ پیڈ تھا وہاں سڑک انتہائی ناقص ٹوٹی پھوٹی تھی کہ اس پر مذکورہ سامان کی آمدورفت میں کسی نقصان کا اندیشہ تھا۔ جس پر سی۔ ڈبلیو۔ او (CWO) نے تیرہ گھنٹوں میں نتھ والا سے ٹلا تک کی کچی سڑک کو کارپٹ کر دیا۔ اس ادارے نے نہ صرف مذکورہ سڑک کو کارپیٹ کر دیا بلکہ اس راستے میں کئی ایک پلوں کا معائنہ کر کے انہیں آنے والے قافلے کے لئے تسلی بخش حد تک قابل استعمال بنا دیا۔ یہ ایک بڑا کام تھا۔ لیکن آفرین ہے اس ادارے پر کہ جس نے صرف دو دنوں میں یہ کام مکمل کر دیا۔ 55 فٹ لمبے میزائل ایک ایسے وقت میں کہ جب پہلے سے اسکی کوئی اطلاع اور تیاری نہ ہو اور پھر یہ بھی مدنظر رہے کہ اتنے بڑے دیوہیکل میزائل کے ساتھ جو فیول مینکر کنٹرول سسٹم، بیٹریاں اور دیگر بھاری سامان ہوتا ہے۔ ان کی بخیریت منتقلی کوئی آسان چیلنج نہیں ہوتا۔ یہاں پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کہوٹہ سے ملوٹ ایک کی بجائے دو میزائل لے جانے کا طے ہوا تھا۔ تا کہ ایک میزائل میں کسی اچانک خرابی کی وجہ سے دوسرے کو فائر کیا جا سکے۔ محسن پاکستان ڈاکٹر خان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ آنے والے خدشات اور خطرات کو ذہن میں رکھ کر منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ لیکن جب 6 اپریل کو میزائل فائر کیے جانے کا مرحلہ آیا تو بھارت اور اس کے پاکستانی گماشتوں نے کہا کہ پاکستان کے پاس تو بس ایک ہی میزائل تھا اور وہ بھی کسی سے مانگا ہوا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جب 3 اپریل کو کہوٹہ سے دو میزائل ملوٹ لے جانے کا مرحلہ آیا تو اس وقت پاکستان کے پاس بالکل فائر کیے جانے کی حالت میں 6 میزائل مکمل طور پر تیار پڑے تھے۔ جو کئی ایک ماہ قبل سے فائر کیے جانے کی حالت میں موجود تھے۔

غوری میزائل جی ٹی روڈ پر

تین اپریل کی صبح ملوٹ پہنچنے والے یہ دو میزائل دراصل دو اور تین اپریل کی درمیانی رات کو اپنے ''آخری سفر'' پر روانہ ہوئے۔ جس کے لیے یہ طے ہوا تھا کہ جی ٹی روڈ کی ٹریفک نہ روکی جائے۔ بعض ذمہ داران نے رائے پیش کی کہ جب 55 فٹ لمبا میزائل سڑک سے گزرے گا اور اگرچہ اس پر کوئی کور وغیرہ بھی ہوگا۔ لیکن پھر بھی یہ عام لوگوں کی نظروں میں آجائے گا۔ البتہ ڈاکٹر خان نے فیصلہ کیا کہ انہیں عام کارگو کی طرح لے جایا جائے اور جی ٹی روڈ سے گزرنے والی دیگر ٹریفک بند نہ کی جائے۔ لیکن یہ کیا گیا کہ سامنے سے آنے والی ٹریفک کی وجہ سے میزائل بردار ٹریلر کو کہیں سڑک سے بار بار نیچے نہ اترنا پڑے۔ قافلے کے آگے سائرن بجاتی گاڑیاں لگا دی گئی جسکی وجہ سے سامنے سے آنے والی ٹریفک خود بخود اس قافلے کو گزر جانے کی جگہ دیتی رہی۔ اب تو خیر ویسے بھی پورا جی ٹی روڈ دورویہ بن چکا ہے اور یوں پاکستان کا قابل فخر دیوہیکل غوری میزائل جی ٹی روڈ

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

سے گزرنے لگا تو جب دو اپریل کی رات کو قافلہ روانہ ہوا تو کہوٹہ کی سڑک کے دونوں طرف لگے بعض درختوں کی شاخوں کو کاٹنا پڑا اسی طرح روٹ پر بعض دیگر رکاوٹوں کو بھی گرانا پڑا۔

رات کے اندھیرے میں پچاس کے قریب بڑی بڑی گاڑیوں کا یہ قافلہ جا رہا تھا۔ اور اس قافلے کے سب سے پیچھے اور آگے خطرے کی روشنیاں جلاتی اور سائرن مارتی گاڑیاں جا رہی تھیں۔ اس قافلے میں میزائل بردار ٹریلرز کے علاوہ ایمبولنس گاڑیاں، پانی کے ٹینکر، ایٹمی ایندھن کے ٹینکر اور دیگر حساس سامان کو لیئے لوہے کی موٹی چادروں سے بنے ہوئے خصوصی ٹرک بھی تھے۔ یوں یہ قافلہ تین اپریل کی صبح مقررہ وقت پر لانچنگ ایریا پر پہنچ گیا۔

محسن پاکستان ڈاکٹر خان اور انکے سنیئر رفقاء کے ساتھ دو اپریل ہی کو لانچنگ ایریا کا معائنہ کر آئے تھے۔ منگلا کور کے افسران اور جوانوں نے وہاں پر سیکورٹی کا زبردست جال بچھایا ہوا تھا۔ کہ کسی چڑیا کے بھی وہاں پر مارنے کا امکان نہیں تھا۔ اس قافلے کے استقبال کے لئے خان ریسرچ لیبارٹریز کے شعبہ میزائل سازی کے بہت سے وہ ٹیکنیکل لوگ وہاں پر موجود تھے۔ جن کو دو اپریل کی صبح ہی وہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ رات بھر کے سفر کے تھکے ماندے یہ لوگ غوری کا استقبال کر کے تازہ دم ہو چکے تھے۔

حکم کا منتظر غوری

چار اپریل کو ڈاکٹر خان بذریعہ ہیلی کاپٹر لانچنگ ایریا میں پہنچ گئے۔ جہاں انہوں نے خصوصی کنٹرول روم کا معائنہ کیا۔ وہ دیوار پر آویزاں پاکستان کے ایک بڑے سائز کے نقشے کی طرف گئے اور اپنے ساتھیوں سے کچھ باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد وہ کنٹرول روم کی چھت پر گئے اور چھت کے اوپر پھیلائے گئے کیموفلاج جال کے نیچے کھڑے ہو کر اپنی دوربین سے حکم کے منتظر غوری کا جائزہ لینے لگے۔ چھت پر ایک کونے میں کئی ایک دوربینیں پڑی تھیں لیکن ڈاکٹر صاحب ایسے موقع کے لئے ہمیشہ اپنی دوربین استعمال کرتے ہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر خان کے ساتھ جہلم کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل پرویز مشرف بھی کھڑے تھے (سابقہ آرمی چیف وصدر پاکستان) لیکن بڑے دکھ کی بات ہے کہ کل تک یہی مشرف جو ڈاکٹر خان کی گاڑی کا دروازہ کھولتا تھا آج یہ بھی کہوٹہ دشمن لابی میں شامل ہو چکا ہے بلکہ اسی کی ایماء پر کہوٹہ دشمن لابی کے سرغنہ "پرویز بھائی" نے ڈاکٹر خان کی اس قدر توہین اور ہتک آمیزی کی کہ خدا پناہ۔۔ بلکہ اسی پرویز مشرف کے دور میں پرویز ہود نے ڈاکٹر خان کے خلاف اسلام آباد میں مظاہرے کئے اور ڈاکٹر خان کا علامتی جنازہ بھی نکالا!

بہر کیف پرویز مشرف نے بھی دوربین سے سرو کے درختوں کی طرح بلند غوری کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر خان نے غوری کا مکمل ناقدانہ جائزہ لینے کے بعد کہا "Perfect" یعنی ہر چیز بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ اسی دوران ڈاکٹر خان کو کنٹرول روم ہی میں ہاٹ لائن پر اطلاع دی گئی کہ کل یعنی پانچ اپریل کو پروگرام کے مطابق غوری لانچ نہیں کیا جائیگا۔ لیکن اسکی وجہ نہ بتائی گئی اور یہ تاثر پیدا ہونے لگا کہ شاید کسی دباؤ کی وجہ سے غوری کا تجربہ منسوخ کر دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر کسی کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پاکستان کی فضاء میں جوانٹرنیشنل کاریڈور ہے۔ یعنی غوری کے مجوزہ فضائی زون کے آس پاس بین الاقوامی پروازوں کی گزرگاہوں کا ابھی تک تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا۔ اور پاک فضائیہ کو اس

سلسلے میں مزید وقت درکار ہے۔ دراصل یہ بھی ایک احتیاط کا پہلو ہے۔ اس سے یہ بات ایک مرتبہ پھر واضح ہو جاتی ہے کہ افواج پاکستان کس طرح کسی بڑے آپریشن کیلئے تمام جزئیات مدنظر رکھتی ہیں۔

پانچ اپریل کا دن بھی گزر گیا یہاں میں اتنا عرض کرنا ضروری سمجھوں گا کہ سارا دن اور ساری رات ہر کوئی اپنی منزل پر ڈٹا رہا۔ ادھر کے آر ایل میں ڈاکٹر خان کے آفس میں رات گئے تک روشنیاں جلتی رہیں۔ شعبہ میزائل سازی کے سربراہ ڈاکٹر بدرالدین اسی شعبہ کی ایک اہم شخصیت ڈاکٹر جے اے مرزا (جنہوں نے دوسرے دن غوری میزائل کا ریموٹ بٹن دبانا تھا) بریگیڈیر سجاول، انجینئر ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر ایم فاروق اور محسن پاکستان کے پرنسپل اسٹاف افسر میجر اسلام کے علاوہ بعض دیگر متعلقہ انجینئر اور سائنسدان بھی ڈاکٹر خان کے دفتر میں موجود تھے۔ تمام گفتگو کے بعد ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایک آرمی کمانڈر کی طرح آخری ہدایات دیں۔ آپ تمام لوگ صبح ٹھیک 4 بجے یہاں پہنچ جائیں۔ صبح اٹھنے کے لئے دو دو گھڑیوں پر الارم لگائیں اور آپ کے ڈرائیور ٹھیک تین بجے آپ کے گھروں میں پہنچ جائیں گے۔

آپ بھی سوچتے ہوں گے۔ کہ آخر اتنی صبح ڈاکٹر خان نے یہ حکم کیوں جاری کیا؟ دراصل چھ اپریل کو صبح 7:20 لیکر 7:40 کے درمیان غوری لانچ کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور پاک فضائیہ سے مشاورت سے یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ اگر خدانخواستہ پہلا تجربہ ناکام ہوا تو ٹھیک گیارہ بجے دوسرا میزائل لانچ کر دیا جائے گا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان جب اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایات دے رہے تھے تو اس دوران انہیں جی ایچ کیو سے فون آیا کہ وہ کل صبح لیفٹیننٹ جنرل ذوالفقار علی اور دیگر اعلیٰ حکام کے ساتھ بذریعہ ہیلی کاپٹر لانچنگ ایریا میں جائیں گے۔ لیکن ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے یہ کہہ کر ان سے معذرت کر لی کہ ایک ایسے موقع پر جب غوری پراجیکٹ کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے جا رہا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو کیسے تنہا چھوڑ سکتا ہوں جو اس دن سے میرے ساتھ چلے آ رہے ہیں جب یہ پراجیکٹ ابھی کاغذوں پر ہی تھا۔ ڈاکٹر خان نے یہ کہہ دیا کہ میں اپنے رفقاء کے ساتھ بذریعہ روڈ مقررہ وقت تک پہنچ جاؤں گا۔

غوری کے معماروں کی آمد

قارئین کرام! اس بات سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اپنے ساتھیوں کا کس قدر احساس تھا میں یہ تمام معلومات ڈاکٹر خان کے رفقاء ہی سے حاصل کر کے آپ تک پہنچا رہا ہوں۔ ڈاکٹر خان کے ہر رفیق کار کا یہ کہنا تھا کہ انہوں نے ہمیں کہیں بھی تنہا نہیں چھوڑا اور نہ ہی انہوں نے ہمیں کسی کمی کا احساس ہونے دیا ہے۔ دراصل یہ ایک اچھے لیڈر کی خوبیاں ہیں جو ہر طرح کے لوگوں سے اپنا کام لینے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر خان اور ان کے ساتھیوں نے جو کام کیا اس پر تو پوری امت مسلمہ کو ان پر فخر ہے۔ فوجی حکام سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی پانچ اپریل کی رات اس آخری ٹیلیفون گفتگو کے بعد سب سائنسدان اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔

چھ اپریل کی تاریخ ساز صبح چار بجے سے پہلے ہی ڈاکٹر خان کے تمام قریبی رفقاء کار کہوٹہ کے راولپنڈی آفس کے سیکورٹی زون میں آنا شروع ہو گئے۔ یہ کہوٹہ کی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ تمام اہم انجینئر ز اور سائنسدانوں کو بیک وقت صبح چار بجے طلب کیا گیا تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ 1976 کے اوائل میں جب کہوٹہ پراجیکٹ ابھی ابتدائی مراحل میں تھا تو ڈاکٹر خان سمیت ان کے کئی رفقاء رات کو ادھر ہی سو جایا

کرتے۔ ماضی کے ان دنوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ڈاکٹر خان اور ان کے ساتھی آج اتنی جلدی فجر کی اذانوں سے بھی پہلے یہاں آرہے تھے۔ سیکورٹی پر مامور اہلکار بجلی کی وافر روشنی ہونے کے باوجود آنے والے ہر شخص کی گاڑی کے نمبر کا بغور جائزہ لیتے۔ ہر سائنسدان اور انجینیر کے چہرے کو بیٹری کے ساتھ دیکھنے کے بعد ہی آگے جانے دیتے تھے۔

ڈاکٹر خان کے پرنسپل سٹاف افسر میجر اسلام الحق کے مطابق جب میں کے آر ایل کے پنڈی آفس میں صبح چار بجے پہنچا تو مجھے یہ جان کر تعجب ہوا کہ ڈاکٹر خان کے کمرے کی بتیاں روشن ہیں۔ جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو انہیں کرسی پر بیٹھا دیکھ کر مزید حیران ہو گیا۔

قارئین کرام! ذرا اندازہ لگائیں کہ جس شخص نے اپنی راتوں کی نیند اور دن کا سکون صرف اسی لئے اپنے اوپر حرام کر لیا تا کہ میری قوم چین کی نیند سو سکے۔ ڈاکٹر خان کے سٹاف افسر میجر اسلام نے مجھے بتایا کہ ”ڈاکٹر خان کام کے معاملے میں بہت سخت تھے لیکن اس سے بھی زیادہ خوش آئند بات یہ تھی کہ ہر کوئی انکی سربراہی میں کام کرنے کو سعادت سمجھتا تھا۔ ان جیسا انسان شاذ و نادر ہی پیدا ہوتا ہے۔ میں جب بھی انہیں یہ بات کہتا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کی سربراہی میں کے آر ایل بہت ترقی کر رہا ہے آپ کیوں اتنے فکر مند ہو جاتے ہیں کہ آپ نے کہوٹہ پراجیکٹ کے لئے رات اور دن کا فرق ہی مٹا دیا ہے تو ڈاکٹر خان فرماتے میجر اسلام! میرے پاس وقت انتہائی کم ہے ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے پراجیکٹ میں دیر لگا دیں اور ملک دشمن اس سے آگاہ ہو جائیں اور کہیں اسے بند ہی نہ کروا دیں۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے قوم اور اپنے آپ سے جو وعدہ کیا اسے اللہ کی مدد سے پورا بھی کیا“

خیر مختصر یہ کہ ٹھیک ساڑھے چار بجے دو ائر کنڈیشن کوسٹروں میں کے آر ایل کی ہائی کمان ملوٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ پہلی کوسٹر جس میں ڈاکٹر خان اپنے رفقاء کے ساتھ سوار تھے۔ جب ہائی وے پر پہنچی تو ڈرائیور نے سورۃ یاسین کی کیسٹ آن کر دی ڈاکٹر خان سے آگے والی نشست پر تشریف فرما انجینئر ڈاکٹر فاروق احمد کا کہنا ہے جب یہ خصوصی کوسٹر تھوڑا آگے بڑھی تو میں نے ڈاکٹر خان سے بات کرنے کے لئے پیچھے منہ کیا تو میں نے یہ دیکھا ڈاکٹر خان نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں اور ان کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ بعد میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیسٹ کے ساتھ تلاوت فرما رہے ہیں۔

کوسٹر میں چائے کے تھرماس اور بسکٹ موجود تھے۔ لیکن سارے راستے میں کسی نے بھی چائے نہ پی ہر کوئی اپنے ذہن میں آنے والے لمحات کو بسائے بیٹھا تھا۔ جیسا کہ انکی شخصیت کے متعلق باب میں ذکر ہے کہ ڈاکٹر خان کی حس مزاح بہت تیز ہے۔ تو کوسٹر میں بھی فضا بوجھل سی تھی۔ جب کوسٹر جی ٹی روڈ کے اس مقام پہنچی جہاں سے ایک سڑک چکوال کی طرف جاتی ہے تو ڈاکٹر صاحب نے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا ”بریگیڈیر سجاول صاحب یہ سڑک کہا جاتی ہے“ تو اس بات پر کوسٹر میں چند قہقہے بلند ہوئے (چونکہ بریگیڈیر سجاول چکوال کے رہنے والے ہیں) اور یوں کوسٹر کی بوجھل فضا خوشگوار ہو گئی۔

ڈاکٹر خان کے انتہائی معتمد خاص جن کا ذکر بھی کتاب میں کسی باب میں درج ہے کا کہنا کہ ”سفر کی ابتداء میں آنے والی آزمائش کی گھڑی کے دباؤ کو کم کرنے کے لئے اس طرح کی ہلکی پھلکی باتیں جاری رہیں۔ لیکن جوں جوں ہم لانچنگ ایریا کے قریب جا رہے تھے۔ توں توں خود محسن پاکستان کے چہرے پر سنجیدگی، غور و فکر اور پریشانی کے آثار واضح ہوتے جا رہے تھے۔ چند منٹ بعد میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر خان کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ اپنے ماضی کی دیرینہ رفاقت کے تجربے میں اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنی مرغوب دعا ”نصر من اللہ و فتح قریب“ پڑھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر خان کے رفقا گزشتہ پندرہ بیس برس سے ڈاکٹر خان سے انتہائی قربت کی بنا پر ان کی حرکات و سکنات سے ان کی ذہنی کیفیت کا

اندازہ لگا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر خان کے ساتھیوں کے مطابق جب وہ اپنے مشن کی تکمیل میں پہنچ جاتے تو مذکورہ دعا کثرت سے پڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر خان اور ان کے ساتھیوں کا یہ قافلہ قریباً ساڑھے چھ بجے ملوٹ پہنچ گیا۔

غوری پاک فضاؤں میں

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حکم کا منتظر غوری لانچنگ پیڈ پر یوں کھڑا تھا جیسے لاہور میں کھڑا مینار پاکستان! آج غوری اور غوری کے معماروں کے امتحان کا وقت تھا۔ آج چھ اپریل کو غوری کے تخلیق کاروں کے دلوں کی دھڑکن ہر کوئی سن سکتا تھا۔ انسان کے بس میں تو کوشش باقی پھل لگانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ غوری کے خالق یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ اگر خدانخواستہ کوئی انہونی ہوگئی تو کہوٹہ دشمن لابی ہمارا جینا محال کردے گی۔ چھ اپریل کو موسم بالکل صاف تھا۔ اور موسم کو میزائل لانچنگ کے لئے آئیڈیل قرار دیا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ وسوسوں میں مبتلا تھے لیکن ڈاکٹر خان پوری طرح مطمئن نظر آ رہے تھے۔ اور انہیں مکمل یقین تھا کہ ابھی غوری تین سو کلومیٹر بلندی پر جا کر بلوچستان میں پہلے سے طے شدہ ٹارگٹ ایریا کا رخ اختیار کرے گا انہیں کامل یقین تھا کہ آئندہ چند منٹ براعظم ایشیا کے تاریخ ساز لمحات ہونگے۔

ملوٹ میں لانچنگ پیڈ کے گرد سیکورٹی زون میں آباد خیموں کے شہر میں موجود ہر شخص کی نظریں غوری میزائل پر لگی تھیں۔ خیموں کے اس شہر میں 3 اپریل سے تین سو کے قریب افراد موجود تھے۔ ان میں آدھے ٹیکنکل لوگ تھے۔ اور آدھے فوجی جوان تھے۔ جو مختلف فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ کہوٹہ کے شعبہ میزائل سازی کے انچارج جناب بدرالاسلام اور انکے دست راست ڈاکٹر جاوید ارشد مرزا بھی پوری طرح مطمئن تھے۔ کے آر ایل کے شعبہ میزائل سازی میں غوری میزائل کے انجن کو ٹیسٹ کیا جا چکا تھا اور اسکے کنٹرول سسٹم اور خودکار کمپیوٹر میزائل سے وابستہ ساتھی بھی محسن پاکستان کی طرح بالکل مطمئن نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ وہ بہت جلد پوری قوم کی نگاہوں میں سرخرو ہونے والے تھے۔ کے آر ایل سائنسدانوں اور انجینئرز نے تین اپریل کو غوری میں اعلیٰ سطحی ایندھن بھر دیا تھا اور اسی دن تمام کنٹرول نظام بچھا دیا گیا تھا۔ ہر کیبل اور کنٹرول سسٹم کو بار بار چیک کر لیا گیا تھا غوری کے پاک فضاؤں میں بلند ہونے کے حوالے سے ہر شعبہ ڈاکٹر خان کے مطلوبہ معیار کے مطابق تسلی بخش طریقہ سے کام کر رہا تھا۔ اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ چار اپریل کو انٹرنیشنل کوریڈور کے کلیئر نہ ہونے کی وجہ سے غوری کا لانچنگ پروگرام ملتوی کر دیا گیا تھا۔ اسی لئے چھ اپریل کو غوری کے تجربہ کے لئے کسی اضافہ کاروائی کی ضرورت نہ تھی۔

غوری میزائل کے بانی ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے فائرنگ پوسٹ کا معائنہ کیا اور تمام انتظامات چیک کر کے کنٹرول روم میں واپس آ گئے۔ جہاں پر جہلم کور کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل پرویز مشرف (سابقہ آرمی چیف، وصدر پاکستان) لیفٹیننٹ ذوالفقار علی خان اور دیگر اعلیٰ فوجی افسران بھی موجود تھے۔ فائرنگ پوسٹ غوری میزائل سے کوئی زیادہ دور نہ تھی بلکہ چند میٹر کا ہی فیصلہ تھا۔ جسکی وجہ سے خدانخواستہ غوری میزائل کے پھٹ جانے کی صورت میں فائرنگ پوسٹ میں موجود انجینئرز کی زندگی کو زبردست خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ اگرچہ فائرنگ پوسٹ کے ساتھ ہی فائر بریگیڈ اور ایمبولنس گاڑیاں موجود تھیں۔ اور فوجی حکام نے کھاریاں کے ایک فوجی ہسپتال میں خصوصی نگہداشت کے وارڈ میں چند بستروں کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ اور وہ ادویات اور مرہم بھی تیار تھے جو جلے ہوئے جسم پر لگائے جاتے ہیں۔ لیکن خدائے بزرگ وبرتر کے فضل وکرم سے کوئی ہنگامی صورت حال پیدا نہ

ہوئی۔ آج ایک بار پھر غوری نے کسی کو مایوس نہیں کیا تھا۔

کنٹرول روم کے رڈار میں سب کچھ دیکھا جا رہا تھا۔ ملوٹ اور بلوچستان میں ٹارگٹ ایریا کے مقامات کے درمیان ہاٹ لائن موجود تھی فوج کا مواصلاتی نظام پوری طرح متحرک تھا۔ لاؤڈ سپیکر بھی کھول دیئے گئے۔ کونٹ ڈاؤن شروع ہوا، جو امام الدین کر رہے تھے۔ جو پہلے DESTO میں کام کرتے تھے اور بعد ازاں کہوٹہ آ گئے۔ جناب امام الدین ہیں تو سویلین البتہ ان کی آواز بہت گرجدار ہے انہوں نے کونٹ ڈاؤن شروع کیا۔۔۔ ٹین، نائن، ایٹ، سیون، سکس، فائیو، فور، تھری، ٹو، ون۔۔۔ فائر۔۔۔ بٹن دبا دیا گیا۔ جو ڈاکٹر ارشد مرزا نے دبایا تھا۔ سٹاپ واچ گھڑیوں پر سات بج کر تیس منٹ ہوئے تھے، جونہی ڈاکٹر ارشد مرزا نے بٹن دبایا تو غوری کا انجن سٹارٹ ہو گیا، چند ہی سیکنڈ میں میزائل میں زبر دست پریشر بلڈ ہو گیا۔ غیر معمولی تیز شعلوں کا طوفان اُمڈ آیا سولہ ٹن وزنی غوری میزائل اوپر اٹھا، ماہرین نے نوٹ کیا کا اسکا لفٹ بالکل ٹھیک تھا۔ ادھر فائرنگ پوسٹ پر تپش نا قابل برداشت ہو رہی تھی۔ لہذا سب نے اپنے ہلمٹ اتار دیئے غوری وطن عزیز کی پاک فضاؤں میں بلند ہو چکا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور بالآخر دوربین سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ تاہم رڈار پر اسکی پرواز دیکھی جا رہی تھی اور ریکارڈ بھی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نذیر جو آج اپنا خصوصی کیمرہ ساتھ لائے تھے انہوں نے سارے منظر کو اپنے کیمرے کی آنکھ میں بند کر لیا۔

دس منٹ بعد نوکنڈی (بلوچستان میں ٹارگٹ ایریا) سے کرنل ذوالفقار کی آواز ابھری "نظر آ گیا" وہ بالکل نظر آ رہا ہے۔ دراصل کرنل ذوالفقار نوکنڈی میں اپنے ساتھیوں سے پر جوش انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ لیکن آرمی کے مخصوص مواصلاتی نظام کی وجہ سے انکی آوازیں کنٹرول روم میں بھی سنی جا رہی تھیں۔ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان جو باوضو تھے فوراً سجدے میں گر گئے۔ جب ڈاکٹر خان سجدے سے اٹھے تو فوجی افسران ان سے گلے ملنے لگے۔ ڈاکٹر خان نے کنٹرول روم ہی سے وزیراعظم میاں نواز شریف کو ٹیلی فون پر مبارک مبادی دی جس پر وزیراعظم نے کہا: تھینک یو ڈاکٹر صاحب! آپ نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ غوری کے کامیاب تجربے کے بعد سب لوگ ہیڈ کوارٹر چلے گئے جہاں پر ایک پر تکلف ناشتہ سب کا انتظار کر رہا تھا۔

❁.....❁.....❁

احمد شاہ ابدالی

احمد شاہ ابدالی کہانی نہیں بلکہ عظیم مسلم سپہ سالار اور حکمران احمد شاہ ابدالی کی سوانح حیات ہے۔ احمد شاہ ابدالی کے آباؤ اجداد گو کہ افغانستان سے تعلق رکھتے تھے لیکن وہ ملتان میں پیدا ہوا۔ یہ کہانی ہے ایک ایسے باہمت نوجوان کی جس نے اپنی زندگی کا آغاز جنگی قیدی کی حیثیت سے کیا لیکن پھر افغانستان کا ایک عظیم حکمران بنا اور افغانستان کو ایک جدید اور رفاحی ریاست بنایا۔ یہ کہانی کتاب گھر کے **اسلامی تاریخی کہانیاں** سیکشن میں پڑھی جا سکتی ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش http://kitaabghar.com

باب پنجم

ایٹمی دھماکے

1۔ میں نے دھماکہ ہوتے دیکھا

2۔ پاکستان کی ایٹمی برتری

3۔ بھارتی سازش

4۔ 13 مئی کا فیصلہ اور اسکے محرکات

5۔ چاغی کی ہیبت ناک سرنگ

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

ایٹمی دھماکے

پاکستان دنیا اسلام کی واحد ایٹمی طاقت ہے جو بلاشبہ ایک اعزاز ہے 28 مئی 1998 کو ہونے والے ایٹمی دھماکوں نے پوری دنیا کے سامنے پاکستان کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ یورپی، یہودی اور ہندو لابیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن ڈاکٹر اور ان کے رفقاء کا عزم ان کی راہوں میں آہنی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر خان نے مجھے بتایا کہ میں بیس، پچیس برس کا عرصہ یورپ میں گزار کر ان کی سازشوں سے واقف ہو چکا تھا ان کی ذہنیت بھی مجھ پر آشکارہ تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ کس طرح انہیں جب پتا چلے کہ مثلاً فلاں بندہ کے آر ایل میں کام کرتا ہے تو وہ اسکے پڑوس میں اپنا گھر لیکر اسے راہ چلتے یا مسجد میں خندہ پیشانی سے ملتے ہوئے راہ و رسم بڑھائیں گے اور دھیرے دھیرے ان سے باتیں اگلوانے کی کوشش کریں گے۔ اسی لئے میں نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ کبھی بھی کسی انجان سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش نہ کریں۔ یہی وہ معمولی احتیاطیں تھیں کہ جن کا محسن پاکستان نے خیال رکھا اور اس معاملے میں وہ بڑے سخت تھے۔ اور بالآخر اسی طرح اپنے آپ کو صرف اور صرف اپنے پراجیکٹ تک محدود رکھنے کی وجہ سے کے آر ایل قوم کی نظروں میں سرخرو ہوئی۔ لیکن حیرت انگیز بلکہ انتہائی مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ایٹمی پروگرام کے خلاف جو لوگ زہر اگلتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایٹمی پروگرام کے نام پر مال بٹور رہا ہے۔ پاکستان جیسا ملک کبھی ایٹمی طاقت نہیں بن سکتا۔ وہی لوگ آج ایٹمی دھماکوں کے بعد خود کو ایٹمی پروگرام کا خالق تصور کرتے ہیں۔ اور اس کے لئے انہوں نے ہر اوچھا ہتھکنڈہ استعمال کیا۔ لیکن کیا کیا جائے چاند پر تھوکا تو منہ پر ہی آتا ہے۔ اور یہی کچھ انکے ساتھ بھی ہوا۔ قارئین جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایٹمی دھماکے تو ہم نے کئے تھے ڈاکٹر خان تو یونہی بن بلائے مہمان کی حیثیت سے آئے تھے۔ ان کی آنکھیں کھولنے کے لئے معروف صحافی جاوید چوہدری کا مضمون ''میں نے دھماکہ ہوتے دیکھا'' ہی کافی ہے۔ جاوید چوہدری نے یہ کالم اس وقت روزنامہ ''خبریں'' میں تحریر کیا تھا۔ آپ کو اس کالم سے اندازہ ہو گا کہ ڈاکٹر خان چاغی میں ایک بن بلائے مہمان تھے یا پراجیکٹ کے ڈائریکٹر جنرل!

قارئین آپ کی سہولت کے لئے جاوید چوہدری کا مضمون من وعن شائع کیا جا رہا ہے۔ آیئے آپ بھی یہ مضمون ملاحظہ فرمائیں۔

میں نے دھماکہ ہوتے دیکھا

صبح چار بجے ابھی اندھیرے میں کہیں کہیں روشنی کے پیوند لگنے شروع ہوئے تھے۔ ہم میں سے کچھ لوگ نماز فجر سے فارغ ہو کر سورہ فاتحہ کی تلاوت کر رہے تھے جبکہ باقی جائے نماز پر رکوع و سجود میں مصروف تھے۔

آج کا دن نہ صرف ہماری زندگی بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کیلئے اہم ترین دن تھا کیونکہ آج یہ فیصلہ ہو جانا تھا کہ آنے والے دنوں میں مسلمان کرہ ارض پر سر اٹھا کر چلنے کی اہلیت رکھتے ہیں یا نہیں؟ ہمارے پراجیکٹ ڈائریکٹر پچھلے چار روز سے مسلسل کچھ پڑھ رہے تھے، ہم میں سے

ایک ساتھی نے پوچھا تو وہ مسکرا کر بولے "یہ فتح کی دعا ہے جب نبی کریم ﷺ کسی غزوہ کے لئے نکلتے تھے تو آپ ﷺ یہی دعا پڑھا کرتے تھے" ایک سیکولر ساتھی نے طنزاً کہا "ڈاکٹر صاحب یہ دعاؤں کا نہیں ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ جس کے پاس جتنی بڑی جدید اور مضبوط ٹیکنالوجی وہ اتنا ہی کامیاب" وہ مسکرا کر بولے "ڈاکٹر صاحب دنیا میں آج تک دعا سے بڑی، جدید اور مضبوط ٹیکنالوجی دریافت ہی نہیں ہوئی" ابھی یہ تکرار جاری تھی کہ کنٹرول باکس کا مائیک آن ہوا۔ سرخ بتی جلی اور صحرا میں دور تک ایک آواز گونجی "ڈیئر آرسم پرابلمز وی آر فیسنگ (There are some Problems we are facing) اور ہم سب کنٹرول روم کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

کنٹرول روم کے حالات واقعی خراب تھے۔ باد پیمائی کے آلات نشاندہی کر رہے تھے ابھی صحرا کی طرف سے ہوا کا ایک طوفان اٹھے گا' ہماری بنائی ہوئی سرنگوں سے الجھتا ہوا' کنٹرول روم کو ہٹ کریگا اور پھر بہتا ہوا دالبدین تک چلا جائے گا۔ صورتحال بڑی خطرناک تھی' ہم سب کے چہرے لٹک گئے' جو لوگ نیوکلیئر ٹیکنالوجی سے وابستہ ہیں وہ ہماری یہ کیفیت سمجھ سکتے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس بیابان میں جب بھی ہوا کا رخ بدلتا ہے تو یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہتا ہے۔ پہلے ہوا نے ہمارے دو قیمتی دن ضائع کر دیئے تھے۔ ہمارے سیکولر ساتھی نے چہک کر کہا "جی ڈاکٹر صاحب اب اس آفت پر بھی کوئی دعا آزمائیں" انہوں نے اپنے روایتی دھیمے پن سے جواب دیا "اللہ بہتر کرے گا فکر مت کریں ابھی ہمارے پاس تین گھنٹے ہیں"

ہم نے اس تبدیلی کی اطلاع اسلام آباد کو کر دی' ادھر سے جواب آیا "پریشان مت ہوں' آج نہیں تو کل سہی' مکمل تسلی سے آپریشن کریں" ہماری کچھ ڈھارس بندھی اور ہم نے اس فرصت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر اپنے نظام کا معائنہ شروع کر دیا۔ سرنگوں پر چار کیمرے اور اتنے ہی مائیک نصب تھے۔ ان سے ذرا فاصلے پر اتنے ہی مزید کیمرے لگائے گئے تھے۔ سرنگ میں نصب کیمروں کا مقصد دھماکے سے چند لمحے قبل اور بعد کے مناظر اور آوازیں ریکارڈ کرنا تھا۔ جس کے بعد لازمی بات تھی اس نظام نے ضائع ہو جانا تھا جبکہ فاصلے پر نصب کیمروں نے اس وقت تک کام کرنا تھا جب تک پہاڑ سے کھسک کر گرنے والے پتھر انہیں پوری طرح ڈھانپ نہ لیتے۔ کیمروں کی ان دونوں نشستوں سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر کیمروں کی ایک اور قطار تھی جس کا کام بیرونی مناظر کی عکس بندی تھی۔ ان کیمروں نے راسکوہ کا سارا پہاڑ فوکس کر رکھا تھا۔ ہم نے کنٹرول روم کا بٹن دبایا۔ سارے کیمرے آن ہو گئے۔ سرنگ کے اندر گھپ اندھیرا ہمارے سامنے تھا۔ دوسرے مانیٹر پر ٹنلز کے دھانے نظر آ رہے تھے۔ جنہیں ہم نے چند روز پہلے ہی سیمنٹ سے بند کیا تھا۔ تیسرے مانیٹر پر سارا راس کوہ پہاڑ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم کنٹرول پینل کی ناب گھما کر پہاڑ کے سایوں میں پھڑکتے ان حشرات الارض کی حرکات تک نوٹ کر سکتے تھے جو صرف انہیں پہاڑوں میں پائے جاتے تھے۔ اور پتھروں کے کھرنڈ ان کی غذا تھی۔

اسی پینل پر دھماکے کی شدت ناپنے والے آلے بھی نصب تھے ہمارے کنٹرولر نے ایک بٹن دبا دیا' سکرین جاگ اٹھی' اس نے دوسرا بٹن دبا دیا دور سرنگ میں ایک مصنوعی دھماکہ ہوا سکرین نے فوراً شدت کا اعلان کر دیا کنٹرولر نے کلپ بورڈ پر چڑھے کاغذ پر نظر ڈالی اور گردن ہلا کر تصدیق کر دی کہ چارٹ پر درج شدہ اور سکرین کے اعلان میں کوئی فرق نہیں۔ اس نے ایک اور بٹن دبایا پینل پر لگے میٹر کی سوئی نے آخری سرے سے سرے تک کرنٹ کے بہاؤ کی تصدیق کر دی' کنٹرولر نے فوراً انگلی اٹھا لی اس کا مطلب تھا کہ پینل سے ڈیوائس تک کرنٹ کا بہاؤ درست تھا۔ اس سے مطمئن ہو کر اس نے ایک بٹن اور دبایا ہم سب نے فاصلے ماپنے والی سکرین پر نظریں جما دیں۔ ڈاکٹر ثمر بولے "ساؤتھ ویسٹ 45 ڈگری' کنٹرولر

نے ناب گھمائی' پہلے سکرین پر سمت ظاہر ہوئی پھر زاویۓ' چند لمحوں تک سکرین پر رنگوں کی لہریں دوڑتی نظر آئیں، پھر ''ٹیں ٹیں'' کی باریک آوازیں آئیں اور سکرین پر ۲۲ کلومیٹر کے ہندسے ظاہر ہوگئے۔ اس کا مطلب ۴۵ کلومیٹر تھا گویا دھماکے کے بعد ان ۲۲ کلومیٹر کے اندر جو بھی تبدیلی آتی ہمارے مانیٹر اسے ریکارڈ کر لیتے۔ ڈاکٹر ثمر نے کہا ''ایسٹ نارتھ ۶۵ ڈگری'' کنٹرولر نے ناب گھمائی اور عمل شروع ہوگیا بعد ازاں ڈاکٹر ثمر ہدایات جاری کرتے رہے۔ کنٹرولر ناب گھماتا رہا سکرین پر ہندسے چمکتے رہے' آخر میں کنٹرولر نے ناب روک کر ''آٹو'' کا بٹن دبایا تو سارا پینل مختلف آوازوں' روشنیوں' لکیروں اور جلتے بجھتے جگنوؤں کی شکل اختیار کر گیا۔ جی ہاں ہمارے پینل میں ایک خودکار نظام بھی نصب تھا اگر ہم چاہتے تو صرف ایک بٹن دبا کر چند سیکنڈ میں صورت حال کی ساری جزئیات ریکارڈ کر سکتے تھے۔

ٹھیک ۴ بج کر ۲۹ منٹ اور ۳۲ سیکنڈ پر ریت سے بھرا ایک جھکڑ آیا' کنٹرول روم سے ٹکرایا اور دور دالبدین شہر کی طرف نکل گیا۔ پینل پر طوفان کی شدت ظاہر ہوئی تو ہمارے چہرے مزید لٹک گئے کیونکہ ہوا کے اس قدر شدید دباؤ میں اور وہ بھی شہر کی طرف' دھماکے کا رسک نہیں لیا جا سکتا تھا' اگر خدانخواستہ ہم ناکام ہو جاتے' سرنگ کی مٹی تابکاری کو ڈھانپنے میں ناکام ہو جاتی' پہاڑ میں ''کریکس'' پڑ جاتے تو ہوا تابکاری کے اثرات اڑا کر لے جاتی اور اس کے بعد کیا ہوتا؟ یہ سوچ کر ہی ہماری روحیں دہل جاتی تھیں' ہزاروں لاکھوں لوگوں کی موت' اگلی پچاس ساٹھ نسلوں کی معذوری' پوری دنیا میں نشان عبرت ہم سب کچھ نہ کچھ پڑھ رہے تھے جس کو جو آتا تھا وہ پڑھ رہا تھا جس کو کچھ نہیں آتا تھا وہ ''یا اللہ رحم'' کا ورد کر رہا تھا۔

ہم ڈیڑھ سو سے زائد افراد پاکستان کے ایٹمی دماغ' اس وقت اس تنگ گھاٹی میں محصور تھے' سامنے راسکوہ پہاڑ کے پار ایک طویل اور جلا دینے والا ریگستان تھا۔ ایسا ریگستان جس کے بارے میں مقامی آبادی میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا تھا یہ ریگستان ایسے جنوں کا ہیڈ کوارٹر ہے جو اپنی زمین پر کسی غیر کا سایہ برداشت نہیں کرتے۔ چنانچہ آج تک ادھر کا رخ کرنے والے ڈھور ڈنگر بھی جان سے جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ادھر چڑیلوں کا قبضہ ہے۔ ان لوگوں نے ان کہانیوں کو حقیقت ثابت کرنے کیلئے طرح طرح کی دلیلیں گھڑ رکھی تھیں جنہیں سن کر ہنسی آتی تھی لیکن ہم میں سے کبھی کوئی شخص ان لوگوں کے سامنے ہنسا نہیں اس کی دو وجوہات تھیں ایک تو ہم اپنے کام میں اس قدر مشغول رہتے تھے کہ ہنسنا تک بھول چکے تھے۔ دوم ہم جس حساس کام میں مصروف تھے اس میں ہمیں مقامی لوگوں کا زیادہ سے زیادہ تعاون درکار تھا چنانچہ یہ لوگ جب بھی ہمیں کوئی ''فنی سٹوری'' سناتے ہمارا جواب استعجاب اور مرعوبیت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

پچھلے چار پانچ روز تو بڑے کرب میں گزرے کیونکہ ہمیں ۲۳ مئی کی شام اسلام آباد سے پیغام ملا سرحد پار سے بری اطلاعات موصول ہو رہی ہیں آپ رات کو بتی ہرگز نہ جلائیں' ایک دوسرے سے دور دور سوئیں اور حفاظتی مورچوں سے باہر کم ہی نکلیں۔ رہی سہی کسر پاک فضائیہ کے طیاروں نے پوری کر دی جو چوبیس گھنٹے پورے چاغی کے اوپر منڈلاتے رہتے تھے۔

ہمیں معلوم تھا اگر اس نازک وقت میں دشمن نے ہم پر حملہ کر دیا' امریکی سیٹلائٹ نے ان کی رہنمائی کی اور انہوں نے ہم پر میزائل داغ دیا تو نہ صرف راسکوہ پہاڑ میں چھپے ہمارے بم ضائع ہو جائیں گے۔ بلکہ وہ تباہی آئے گی جس کا سلسلہ پنجاب کے میدانوں' دریاؤں' سندھ کے کناروں اور ادھر ایران کے سرحدی علاقوں تک پھیلتے دیر نہیں لگائے گا۔ رہے ہم تو ہماری تو داستانوں تک نہ ہوگی داستانوں میں' لیکن ان تمام تر

خطرات کے باوجود ہمارے حوصلے اسی طرح جوان تھے۔ ہم میں سے کسی شخص نے کمزوری، بے ہمتی اور خوف کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا ہم ضرور اس صحرا سے کامیاب لوٹیں گے۔ ہم اپنے قرب وجوار میں اللہ کی نصرت کی چاپ سن رہے تھے۔

۲۶ کی شام جب ہم نے اپنی تیاریاں مکمل کر لیں اسلام آباد کو گرین سگنل دے دیا اور ہیلمٹ اتار کر اپنی جلی ہوئی جلد پر کریم ملنے لگے تو اچانک ہوا نے رخ بدل لیا۔ صحرا سے ریت کے جھکڑ کنٹرول روم کی طرف بہنے لگے، ہم پریشان ہو گئے کیونکہ اس کا سیدھا سادھا مطلب تھا ہم ۲۷ کو دھماکہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے ہم نے دوبارہ ہیلمٹ پہنے اور اپنی اپنی پناہ گاہ میں سر دے کر بیٹھ گئے۔ اس روز رات بھر ہوا چلتی رہی۔ رات بھر ہم دعائیں کرتے رہے یہاں تک کہ ۲۷ مئی کی صبح طلوع ہو گئی لیکن ہوا کا رخ نہیں بدلا۔ بادپیما کا گراف نیچے نہیں آیا اس روز درجہ حرارت بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ دن کے دس بجے ۵۳ ڈگری سینٹی گریڈ ہو گیا۔ جس میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم اپنے سروں اور بازوؤں کو گرم ہوا کے تھپیڑوں سے بچانے کے لئے تولئے بار بار ٹھنڈے پانی میں ڈبوتے اور اوپر اوڑھ لیتے لیکن چند ہی منٹ بعد ہمیں دوبارہ پانی کی ضرورت پڑ جاتی اس روز رات تک یہ عذاب جاری رہا ادھر پندرہ منٹ بعد اسلام آباد سے پیغام آتا ''کیا صورت حال ہے'' ہم فوراً ہوا کا دباؤ اور رخ ماپ کر بتا دیتے جس کے جواب میں ادھر سے سسکی کی آواز آتی اور رابطہ منقطع ہو جاتا۔

رات کے دس بجے جی ہاں ۲۷ مئی کی شب ٹھیک دس بجے ہوا کا رخ بدل گیا اب وہ دالبدین سے سرنگ اور وہاں سے دور صحرا کی طرف بھاگنے لگی۔ ہم نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ ہم میں سے چند احباب نے نفل پڑھنے شروع کر دیئے جبکہ باقی ایک دوسرے کو مبارک بادیں دینے لگے۔ ہمیں یوں محسوس ہوا اب منزل دور نہیں۔ اسلام آباد کو فوری پیغام دیا گیا ''سر ہم تیار ہیں اگر اجازت ہو تو صبح سات بجے بسم اللہ کر دیں'' ادھر سے جواب آیا ''ہم آپ کی تجویز پر غور کر رہے ہیں۔ آپ اپنی تیاریاں جاری رکھیں''

اس رات ہم میں سے کسی شخص نے ایک لمحے کے لئے بھی آنکھ تک نہیں جھپکی، ہم سب ایک سنسنی انگیز ایٹمی اور حیرت کے گھرے احساسات کے ساتھ رات بھر اپنا سسٹم چیک کرتے رہے۔ کیمرے آن کر کے دیکھتے کرنٹ کا بہاؤ چیک کرتے، بادپیمائی کے آلات دیکھتے، جب سرشاری حد سے گزر جاتی تو باہر نکل کر شفاف آسمان سے باتیں کرنے لگتے۔ ہمیں یقین تھا صبح ہم پر نئے انعامات و کرامات لے کر طلوع ہو گی۔ ہم فتح کے پھریرے لہراتے ہوئے اسلام آباد جائیں گے۔ ہم میں سے کچھ پچھلے دو برسوں سے اس بیابان میں آباد تھے، چند ماہ سے مقیم تھے جبکہ ہم لوگ ۱۵ مئی کو آئے تھے ہمارا خیال تھا کہ ہم عہد قدیم کے کسی صحرا میں جا رہے ہیں لیکن جوں ہی ہماری جیپیں سائٹ پر پہنچیں تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہاں تو پورے کا پورا عارضی شہر آباد تھا۔ ریسٹ ہاؤس تھا، باتھ روم تھے، ڈائیننگ ہال اور کھیل کا چھوٹا سا میدان تھا۔ بڑے بڑے جنریٹروں نے جنگل میں منگل کر رکھا تھا لیکن ان تمام سہولیات کے باوجود ۵۴ سینٹی گریڈ میں کام کرنا آسان نہیں تھا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمیں ان مشکل ترین دنوں کا احساس ہی نہ ہوا اور وہ دن بھی دوزخ کی گرمی سے تپتے دن، ظاہر ہے ہم کسی پکنک پر تو آئے نہیں تھے قوم کی خدمت کے لئے آئے تھے جس نے ہمیں عزت اور وقار سے بھرپور ایک نرم اور گرم کامیابی کی سرسراہٹ سن رہے تھے۔

دو بج کر چالیس منٹ پر محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے آخری ہدایات دیں۔ انہوں نے ہم سب کو فرداً فرداً گلے لگایا اور شاباش

دی۔ جب وہ ہمیں گلے لگاتے تو ان کے دل کی دھڑکن ہم اپنے سینوں پر محسوس کر سکتے تھے۔ ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ اپنی مرغوب دعا ''نصر من اللہ وفتح قریب'' پڑھ رہے تھے انہوں نے نیک سائنسدان کو قدرے ڈانٹنے کے انداز میں کہا (Don't be Panicky) پھر فرمایا'' میں اپنے مشن کی تکمیل دیکھ رہا ہوں۔ میری قربانیاں رنگ لانے والی ہیں'' ہم سب پینل کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر ثمر اور دوسرے سینئر سائنس دانوں نے پوزیشنیں سنبھالیں۔ تین بج کر ایک منٹ پر سپیکر آن ہوئے اور کنٹرول روم میں وزیر اعظم کی بااعتماد آواز گونجی انہوں نے ہماری کوششوں کو سراہا' پیشگی مبارک دی اور آخر میں ہمارے لئے کامیابی کی دعا کی جس پر وہاں موجود ہر شخص کی زبان سے آمین نکلا۔ ان کے بعد چیف آف آرمی سٹاف جنرل جہانگیر کرامت نے بھی اپنے پر اعتماد لہجے میں مختصر خطاب کے ذریعے ہمارا حوصلہ بڑھایا۔

تین بج کر سات منٹ پر ڈاکٹر ثمر مبارک مند نے ہمارے اس ساتھی کے نام کا اعلان کیا جو بٹن دبا کر پہلا دھماکہ کرے گا۔ ڈاکٹر قدیر خان سمیت ہم سب نے اس کو مبارکباد پیش کی۔ اس غریب ٹیکنیشن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہم اس کے جذبات سمجھتے تھے کیونکہ وہ خوش نصیب شخص تھا جسے پاکستان نہیں بلکہ پوری دنیا کا سب سے بڑا اعزاز ملنے والا تھا۔ ۳ بجکر دس منٹ پر سپیکر اور مائیک آن کر دیئے گئے اب ہم اسلام آباد اور اسلام آباد والے ہماری آواز سن سکتے تھے۔ ۳ بج کر گیارہ منٹ پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے سورۃ فاتحہ کی تلاوت شروع کر دی۔ ہم سب نے ناف پر ہاتھ باندھ لئے۔ ۳ بجکر ۱۵ منٹ پر آخری بار سارا نظام دیکھا گیا۔ آخری بار او کے کی آواز آئی۔ ٹھیک ۳ بجکر ۱۶ منٹ پر ہمارے ٹیکنیشن بھائی نے ہاتھ کی انگلی دبا دی' سکرین پر ۱۰ کا ہندسہ ابھرا' پھر ۹ آیا' ۸' ۷' ۶' ۵' ۴' ۳' ۲ اور ہماری سانسیں پھول گئیں۔ پسینہ ابروؤں پر آ کر ٹھہر گیا زبان پر کلمہ شہادت کا ذائقہ اتر آیا۔ سامنے مانیٹر پر روشنی کی ایک لہر لہرائی' بالکل ویلڈنگ جیسی روشنی' نہیں میں غلط کہہ گیا' طوفانی رات میں آسمان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لپکنے والے کوندے کی طرح کی روشنی' اس کے ساتھ ہی ایک دھماکہ کی آواز اٹھی اور ہمارے کیمروں کی پہلی قطار اڑ گئی۔ پہلا مانیٹر بجھ گیا دوسرے مانیٹر پر چٹانیں ٹوٹنے اور تیزی سے نیچے گرنے کا منظر تھا۔ ڈاکٹر خان کے منہ سے کلمہ شہادت نکلا اور ہم سب نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر انہیں جواب دیا۔ ہماری آواز میں وزیر اعظم' آرمی چیف' کور کمانڈر اور چند وزراء کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ہم ننگی اور گرم زمین پر سجدہ ریز ہو گئے۔ ہمارے پورے جسم میں سسکیاں ابل رہی تھیں۔ سامنے سکرین پر دھوئیں کے بادل تھے غبار کی ایک طویل چادر نے راسکوہ کی ساری پہاڑیوں کو آغوش میں لے رکھا تھا ہم اگر سکرین سے نظر ہٹا بھی لیتے تو بھی فضا سامنے تھی۔ فضاء جس پر اب گرد کے پہرے تھے اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور اس کے ازلی فیصلوں کے بے شک صرف اہل ایمان ہی فتح پائیں گے۔

سامنے ریکٹر سکیل پر دھماکے کی شدت ۶ درجے لکھی تھی' سارا نظام ''او کے'' کی رپورٹ دے رہا تھا۔ پہاڑ کے باہر نصب آلات کسی قسم کی تابکاری کی اطلاع نہیں دے رہے تھے۔ ہمارے ایک سینئر سائنسدان بتا رہے تھے اتنا مکمل اور محفوظ دھماکہ آج تک کسی ملک میں نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود زمین لاکھوں برس کے لئے بیکار ہو چکی ہے۔ اب ادھر جو بھی جاندار جائے گا اس پر بیماری کے حملے کا خدشہ ہوگا۔ پینل بتا رہے تھے جب فضا چھٹے گی تو پہاڑ کا رنگ بدل چکا ہوگا۔ آخر اتنی گرمی اور شدت کوئی نہ کوئی اثر تو چھوڑے گی۔ ایک سینئر سائنسدان نے بتایا پہاڑ کی بلندی کم از کم دس میٹر کم ہو جائے گی کیونکہ دھماکے کے بعد ہر چیز مائع بن جاتی ہے جس سے اندر ایک خلا بن جاتا ہے جسے بھرنے کے لئے پہاڑ اوپر سے

نیچے کھسک آتا ہے۔

ادھر سپیکر سے "مبارک مبارک" کی آوازیں آرہی تھیں جبکہ میں سوچ رہا تھا کہ شدید دھماکے کے بعد دالبدین کے صحرائی جن اپنا ٹھکانہ بدل چکے ہوں گے۔"

محترم قارئین! آپ نے اس کالم میں بھی یہ پڑھ لیا ہے کہ پراجیکٹ ڈائریکٹر ڈاکٹر خان ہی تھے آخری ہدایات بھی خان صاحب ہی نے دی تھیں۔ پوری قوم کی دعائیں اور محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کے رفقاء کی محنتیں رنگ لائیں۔ اور یوں ہم ایٹمی ملک بن گئے۔ ۲۸ مئی کو سہ پہر 3:15 منٹ پر جب ایک ٹیکنیشن نے چاغی کے علاقے میں ایٹمی دھماکوں کا بٹن دبایا۔ تو بی بی سی نے فوراً پاکستان کے دو ایٹمی دھماکوں کی خبر نشر کر دی۔ جسکے بعد مختلف اخبارات کے ایٹمی دھماکوں کے حوالے سے خصوصی ضمیمے چھپ کر بازار میں آئے۔ پاکستان آبزرور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ سب سے پہلے اسی قوم اخبار کے ضمیمے چھپ کر بازار میں آئے، بی بی سی سے بار بار" پاکستان آبزرور" کے ضمیمے کی تصویر دکھائی جارہی تھی۔ اسلام آباد کے سیکٹر E-7 میں محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی رہائش گاہ پر عوام کا ایک جم غفیر انہیں مبارک باد دینے کے لئے پہنچ گیا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی رہائشگاہ سے ملحقہ سڑک پر تاحد نگاہ پھیلے ہوئے عوام اپنے محبوب محسن کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ مگر وہاں پر موجود سیکورٹی والوں نے انہیں اس یقین کے ساتھ واپس بھیج دیا کہ ان کے جذبات ڈاکٹر خان تک پہنچا دیے جائیں گے۔ ادھر ملک بھر میں دھماکوں کی خبر سے ہی عوام سڑکوں پر پہنچ گئے۔ ملک بھر میں مٹھائی کی دکانیں پل بھر میں خالی ہوگیں۔ وطن عزیز میں جشن کا ساماں تھا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ دوسری بڑی خوشخبری عوام کو ملی تھی۔ اور یہ بجا طور پر پوری قوم کیلئے فخر کا مقام تھا۔

پاکستان کی ایٹمی برتری

۳۰ مئی کو دن ۵۵:۱۱ پر پاکستان نے چھٹا ایٹمی دھماکہ کر کے اپنی دھماکوں کی موجودہ سیریز مکمل کر لی۔ اس دھماکے کے بعد پاکستان نے ایک اور ایٹمی دھماکہ کر کے بھارت کے ۱۸ مئی ۱۹۷۴ء، ۱۱ مئی ۱۹۹۸ کے کل چھ دھماکوں کا سکور برابر کر کے بھارت سے آخری دھماکے سے برتری بھی حاصل کر لی۔ جس وقت پاکستان کے ۳۰ مئی کے ایٹمی دھماکوں کی خبر بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کو ملی تو وہ اس وقت بھارتی لوک سبھا کے اجلاس میں تھا۔ واجپائی نے لوک سبھا میں کہا کہ ایٹمی دھماکے پاکستان اور بھارت کے مابین کوئی کھیل تو نہیں کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے مخالف فریق سے زیادہ سکور کیا جائے۔ پاکستان کے دھماکوں کی اطلاع ملتے ہی "لوک سبھا" کے اجلاس میں شریک اکثر ارکان اٹھ کر چلے گئے۔ جبکہ اٹل بہاری واجپائی کے چہرے سے پریشانی اور بدحواسی عیاں تھی۔

بھارتی سازش

قارئین کرام! یہی واجپائی جو آج پاکستان کے ایٹمی دھماکوں سے بوکھلا گیا تھا۔ اس نے بھارتی ایٹمی دھماکوں کے فوراً بعد رعونت سے کہا کہ "اب پاکستان کو چاہیے کہ وہ ہمارے ساتھ سر نیچا کر کے بات کریں" اور جیسا کہ آپ آگاہ ہیں کہ اپنے ایٹمی دھماکوں کے بعد بھارت اپنی فوجیں

کنٹرول لائن پر لے آیا تھا۔ اور تقریباً تمام اطراف سے پاکستان کی سرحدوں پر بھارتی فوج سٹینڈ بائی کی حالت میں بیٹھی تھی ان حالات میں پاکستان کے لئے ایٹمی دھماکہ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ جب بھارت کو معلوم ہوا کہ پاکستان ایٹمی دھماکہ کرنے والا ہے تو چانکیہ کے چیلوں نے اپنے عیار ذہنوں میں ایک گھناونی سازش رچالی۔ بھارت نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام اور کے آر ایل کو سبوتاژ کرنے کا گھناونہ منصوبہ بنالیا تھا۔ لیکن یہاں پر پاکستان کی آئی ایس آئی خصوصی طور پر مبارکباد کی مستحق ہے کہ جس نے قبل از وقت اس منصوبے سے آگاہی حاصل کرلی۔ قارئین کرام یہاں میں آپکو ایک دلچسپ بات سے آگاہ کرتا ہوں وہ یہ کہ بھارت کے کسی بھی معاہدے پر دستخطوں کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوپاتی کہ ہماری قابل فخر آئی ایس آئی اس سے آگاہی حاصل کرلیتی ہے۔ اور یہی اس وقت ہوا کہ جب بھارت نے ہمارے نیوکلیئر پروگرام کو تباہ کرنے کی سازش رچائی۔

دراصل وزیراعظم میاں نواز شریف جمعہ کے دن کو سیدالایام سمجھتے ہیں اسی لئے انہوں نے دھماکوں کے لئے 29 مئی بروز جمعۃ المبارک کی تاریخ کا اعلان کیا تھا اور اس حوالے سے تمام تیاریاں بھی مکمل تھیں کہ اچانک 27 مئی کی رات اطلاع موصول ہوئی کہ بھارت اور اسرائیل ملکر کہوٹہ اور چاغی پر بیک وقت مشترکہ حملے کی تیاری کررہے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے بھارت نے اسرائیلیوں کے لئے جنہیں عراق کے ایٹمی پلانٹ پر حملہ کا تجربہ بھی حاصل ہے اپنے اڈے خالی کردئے ہیں۔ ادھر بھارتی اور اسرائیلی قیادت نے یہ حتمی فیصلہ بھی کردیا تھا کہ جمعرات 28 مئی کی صبح پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ کردیا جائیگا۔ چنانچہ دشمن کی طرف سے کسی ممکنہ جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے وطن عزیز کے تمام ایئربیسز پر ہنگامی حالت کا اعلان کردیا گیا اور ہائی الرٹ کا اعلان بھی کردیا گیا۔ یوں ایٹمی دھماکے ۲۹ مئی کی بجائے ۲۸ مئی کو کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تو اس طرح بھارت اور اسرائیل کی ناپاک سازش دھری کی دھری رہ گئی۔

13 مئی کا فیصلہ اور اس کے محرکات:

۱۱ مئی کو بھارتی ایٹمی دھماکوں کے وقت وزیراعظم نواز شریف الماتے (قازقستان) میں سرکاری دورے پر تھے۔ وزیراعظم کی ہدایت پر ان کے پرنسپل سیکرٹری سعید مہدی نے ڈاکٹر خان اور آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت کو فون کیا اور پوچھا کہ وزیراعظم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ پاکستان کتنے دنوں میں ایٹمی دھماکہ کرسکتا ہے۔ آرمی چیف نے کہا کہ ایک ماہ میں جبکہ ڈاکٹر قدیر خان نے انہیں بتایا کہ ہم پانچ دنوں میں ایٹمی دھماکہ کرسکتے ہیں۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی انہوں نے ایٹم بم تیار کیا ہوتا یا انکا نیوکلیئر پروگرام میں کوئی کردار ہوتا۔ یا انکے پاس ایٹمی دھماکے کرنے ہی کی کوئی اہلیت ہوتی تو وزیراعظم آرمی چیف اور ڈاکٹر خان کی بجائے ان سے رابطہ نہ کرتے اگر مذکورہ باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی سچی ہوتی تو وزیراعظم ڈاکٹر اشفاق جو کمیشن کے چیرمین تھے سے بات کرتے۔ سب سے بڑا فیصلہ عوام کا ہوتا ہے کہ جن کے دلوں میں ڈاکٹر خان آج بھی ایک مسیحا اور دیوتا کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ لوگ آخر وقت تک نیوکلیئر پروگرام ہی کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ لیکن جب دھماکے ہوگئے اور عوام نے ڈاکٹر خان کو ہیرو کا درجہ دے دیا تو حسد اور بغض کے مارے ان لوگوں نے فوری طور پر اپنا چولہ بدلہ اور کل تک جس ایٹمی پروگرام کے خلاف زہر اگلتے تھے۔ آج اس ایٹمی پروگرام کے خالق ہونے کا دعوی کرنے لگتے ہیں۔ تو خیر جب وزیراعظم وطن واپس آئے تو 13 مئی کو ان کی صدارت میں کابینہ کی ڈیفنس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں تینوں مسلح افواج کے سربراہان کے علاوہ محسن پاکستان ڈاکٹر خان کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ یہ بات بھی

قابل غور ہے کہ اگر ایٹمی توانائی کمیشن کا نیوکلیئر پروگرام میں کوئی رول ہوا تو کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر اشفاق بیرون ملک ہونے کی بجائے پاکستان میں ہوتے اور وہ بھی خاص طور پر اس وقت میں کہ جب بھارت کی طرف سے ایٹمی دھماکے کر کے پاکستان کے خلاف جنگ کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ اور چند دن بعد پاکستان بھی ایٹمی دھماکہ کرنے والا تھا۔ ان کے جھوٹے دعوں اور اعمال سے ہی انکا مکروہ چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ یہاں میں قارئین کو ایک اور دلچسپ بات سے آگاہ کرتا چلوں کہ پرویز ہود بھائی جسے میں بے ہودہی کہوں گا۔ وہ آج تک پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا مخالف ہے اور کہتا ہے کہ پاکستان کو ایٹمی ہتھیار تلف کر دینے چاہیں۔ المختصر کابینہ کی اس کمیٹی کے اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ

(۱) پاکستان بھارت کے ایٹمی دھماکوں کا جواب ایٹمی دھماکوں سے دے گا۔

(۲) ایٹمی دھماکے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کرے گا جو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی نگرانی میں ہوں گے۔

قارئین کرام! آپ کو بھی تعجب ہوا ہوگا کہ ڈیفنس کمیٹی کے اجلاس میں یہ فیصلہ اچانک کیونکر کر دیا گیا کہ چاغی میں ایٹمی دھماکے اٹامک انرجی کمیشن کرےگا۔ یہ بات بھی میرے علم میں ہے کہ اس حوالے سے بعض حضرات کے دل کا کوڑہ کیا تھا۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس نیت سے کمیٹی نے یہ فیصلہ دیا تو اس حوالے سے یہ فیصلہ درست تھا۔ وزیراعظم کی زیر صدارت ڈیفنس کمیٹی کی بڑی سوچ وبچار کے بعد وضع کی گئی حکمت عملی سے مقصود تھا کہ اگر چاغی میں ایٹمی دھماکہ کرنے کی ذمہ داری کے آر ایل کو سونپی گئی۔ اور اس سلسلے میں اگر ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کوئٹہ اور چاغی آنا جانا شروع کر دیا۔ تو غیر ملکی انٹیلی جنس ایجنسیوں کو اس کا علم ہو جائے گا۔ کہ پاکستان ایٹمی دھماکہ کرنے والا ہے۔ ڈیفنس کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ دیا کہ آئندہ چند روز تک ڈاکٹر خان اسلام آباد میں ہونے والی ہر اہم تقریب میں آئیں جائیں تاکہ غیر ملکی ایجنسیاں یہی سمجھیں کہ اگر پاکستان نے ایٹمی دھماکے کرنے ہوتے تو ڈاکٹر خان اسلام آباد کی بجائے چاغی میں ہوتے البتہ وزیر اعظم نے ڈاکٹر خان سے کہا کہ اگرچہ ہم بعض مجبوریوں کی بنا پر دھماکوں کا کام کمیشن کو سونپ رہے ہیں لیکن یہ تمام کام آپ کی رہنمائی میں ہوگا۔ اور آپ کو بذات خود دو تین مرتبہ چاغی جا کر اس امر کو یقینی بنانا ہوگا یہ انتہائی نازک اور حساس کام ہر پہلو سے تسلی بخش ہو۔ میاں نواز شریف نے مزید یہ کہا کہ ہم بعض ممالک کو ڈاج دینے کے لئے یہ کام کمیشن کو سونپ رہے ہیں لیکن یہ کام کمیشن کے بس کا نہیں آپکو اس موقع پر بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

اب ڈاکٹر خان کو چاغی میں بن بلایا مہمان کہنے والوں سے کوئی پوچھے کہ یہ ڈیفنس کمیٹی میں جو میاں نواز شریف کے جو الفاظ ہیں وہ بھی جھوٹ ہیں۔

وطن عزیز کے اہم حلقوں کے مطابق یہ فیصلہ درست تھا۔ اور اس فیصلے سے ہمارے پالیسی سازوں اور افواج پاکستان کی قیادت کی ذہانت کا ثبوت ملتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے بھی اس فیصلے کو اسی تناظر میں لیا۔ اور اپنے آپ کو کمیشن کی نگرانی کرنے پر آمادہ کر لیا۔ جب ڈاکٹر خان نے کمیٹی کے اس فیصلے سے کے آر ایل میں اپنے رفقاء کو آگاہ کیا تو ان میں سے بعض نے قدرے تلخ انداز میں کہا کہ ''محنت ہماری' یورینیم ہمارا' ڈیزائین ہمارا' اور کریڈٹ کوئی اور لے'' لیکن ڈاکٹر خان نے اپنی روایتی فراخدلی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ''بات کریڈٹ کی نہیں پاکستان کے وسیع تر قومی مفاد کی ہے''

قارئین کرام! تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ محسن پاکستان ڈاکٹر خان ذاتی طور پر ۱۳ مئی سے لیکر ۲۸ مئی تک تین مرتبہ چاغی گئے۔ اور ایٹمی دھماکوں کے وقت بھی تمام کنٹرول ڈاکٹر خان کے ہاتھ میں تھا اور وہ کمیشن کے متعلقہ ہنر مندوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ کیا اس وقت یہ لوگ اندھے تھے۔ ایک شخص جس کو یہ بن بلایا مہمان کہتے ہیں۔ وہ انہیں کے ورکروں کی تربیت کر رہا تھا۔ اگر ان میں اتنی ہی عقل ہوتی تو یہ خود اپنے ورکروں کی رہنمائی نہ کرتے۔

قارئین کرام! ایٹم بم گریڈ یورینیم ۲۳۵ ڈاکٹر خان کا معجزہ۔۔۔ ایٹم بم کا ڈیزائن اور ڈرائینگیں ڈاکٹر خان کا کمال، ایٹمی تجربات کی تمام تر جزئیات کی نگرانی ڈاکٹر خان کا اعجاز۔۔۔ اور جب ایٹمی دھماکے ہوئے اور پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی تاریخ کی پہلی ایٹمی طاقت ہونے کا اعزاز بخشا۔ تو جو کہتے ہیں کہ پاکستان کے ایٹمی دھماکوں میں ڈاکٹر خان کا کردار پانچ فیصد ہے۔ دراصل ایٹمی دھماکوں کے بعد پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے دشمن ایک نئے روپ میں میدان میں آتے ہیں۔

چاغی کی ہیبت ناک سرنگیں

قارئین کرام! ۲۸ مئی ۱۹۹۸ کو ایٹمی دھماکے میں استعمال کیے گئے ایٹم بموں کا اوسطاً وزن ۵۰۰ کلو گرام تھا۔ جبکہ ۳۰ مئی کو ہونے والے چھٹے ایٹمی دھماکے کے ایٹم بم کا وزن ۲۵۰ کلو گرام ہے۔ جسے دور مار غوری میزائل سے دشمن کے علاقے میں لے جانا آسان ہوتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ۸۰ء کی دہائی میں پاکستان یورینیم افزودہ کر چکا تھا جبکہ ۱۹۸۴ میں محسن پاکستان نے جنرل ضیاء الحق کو بتا چکے تھے کہ ہم ایک مہینہ کے نوٹس پر ایٹمی دھماکہ کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کو شاید یہ جان کر حیرت محسوس ہوگی کہ چاغی کے علاقے میں ہونے والے ایٹمی دھماکوں کے لئے سرنگوں کی کھدائی کا کام ۱۹۷۹ میں شروع ہو گیا تھا اور مختلف مراحل سے ہوتے ہوئے یہ سرنگیں ۱۹۹۵ تک ہر لحاظ سے مکمل ہو چکی تھیں ان کی تکمیل میں اتنا لمبا عرصہ اس لئے لگا کہ بعض مواقع اور وجوہات کی بنا پر کام کو روک دیا جاتا تھا۔ یہ سرنگیں کنواں نما کی بجائے افقی تھیں۔ جسکے لئے زمین کے برابر پہاڑ کے اندر ایک کلومیٹر تک خندق کھودی گئی۔ اس کے بعد انگریزی حرف ایل (L) طرز پر آدھا کلومیٹر لمبی سرنگ کھودی گئی۔ سرنگ کے اندر آمد و رفت کے لئے ہر طرح کی سہولتیں تھیں۔ سرنگ کو روشن رکھنے کے لئے جا بجا بلب لگائے گئے تھے۔ سرنگ کے اندر آمد و رفت یا بھاری سامان پہنچانے کے لئے اسی طرح کی ریل کی پٹری بچھائی گئی تھی۔ جیسا کہ کوئلہ یا نمک کی کان کے اندر بچھائی جاتی ہے۔ کارکنوں اور انجنیئرز کو زندہ رکھنے کے لئے تازہ ہوا اور روشنی پر خصوصی توجہ دی گئی کیونکہ یہ دونوں چیزیں بنیادی ضرورت تھیں۔

بالآخر ڈیڑھ کلومیٹر سرنگ کھودی گئی تو اسکے آخری سرے پر پانچ ایٹمی دھماکوں کے لئے علیحدہ کمرے بنائے گئے یہ پانچ کمرے ساتھ ساتھ اس طرح بنائے گئے تھے کہ ان کے درمیان گرینائٹ کی موٹی موٹی دیواروں نے ان ایٹمی کمروں کو ایک دوسرے سے الگ کر رکھا تھا۔ ان پانچ خصوصی کمروں کی دیواروں کو مزید مضبوط بنانے کے لئے ایک خصوصی طور پر بنائے گئے سیمنٹ سے پلاسٹر کیا گیا۔ ہر کمرے کے درمیان میں لوہے کی خصوصی طور پر بنائے گئے میز رکھے گئے جن پر ایٹم بموں کو رکھا جانا مقصود تھا۔ ایٹم بموں کو سرنگ کے اندر لے جانے سے پہلے تمام متعلقہ کیبلز بچھا دی گئیں۔ کمانڈ پوسٹ جہاں سے آپریٹ کیا جانا تھا۔ مختلف قسم کی تاروں اور کیبلز سے آراستہ تھی۔ ان تمام ابتدائی تیاریوں کے بعد ایٹم بموں کو غار سے

اندر لے جانے کا نازک ترین اور انتہائی خطرناک مرحلے کا آغاز ہوا۔

ایٹم بم کہاں سے چاغی کی سرنگ میں بنے ایٹمی کمروں تک پہنچائے گئے۔ اور کیسے گئے یہ ایک قومی راز ہے۔ جس سے پردہ اٹھانا میرے خیال میں قومی مفادات کے منافی ہے۔

مختصر یہ کہ دھماکوں کے لئے ہر طریقہ سے تیار ایٹم بموں کو لوہے کی مذکورہ میزوں کے اوپر رکھ کر ان الیکٹرک تاروں سے جوڑ دیا گیا جس کے سرے کمانڈ پوسٹ میں موجود ایٹمی بٹن سے منسلک تھے۔

یہ بات خاص طور پر یاد رہے کہ ایٹمی دھماکوں کے لئے اس جگہ کا انتخاب جیولاجیکل سروے آف پاکستان نے کیا تھا سروے آف پاکستان کے اس انتخاب کی حتمی منظوری محسن پاکستان ڈاکٹر خان نے دی تھی۔ اور انہی کی زیر نگرانی یہ تمام کام ہوا تھا۔ کمشن کو تو اسکا علم ہی نہ تھا۔

ایٹمی دھماکوں میں کے آر ایل کا کردار

قارئین کرام! میں اس بات سے بخوبی آگاہ ہوں کہ پاکستان کا ہر شہری اور دنیا کا ہر وہ شخص جو پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے تھوڑی سی وابستگی بھی رکھتا ہو، وہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ ایٹمی دھماکوں کا تمام تر سہرا ڈاکٹر خان اور کے آر ایل کے اولوالعزم ساتھیوں کے سر ہے۔ لیکن میں یہ ضروری سمجھوں گا کہ اس حوالے سے چند تاریخی حقائق سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جائے پاکستان کا ایٹمی پروگرام خان ریسرچ لیباٹریز سے چاغی کی سنگلاخ چٹانوں میں بنی سرنگ تک کیسے پہنچا۔ جیسا کہ میں ابتداء میں عرض کر چکا ہوں۔ پاکستان میں ایٹمی پروگرام کا آغاز اس وقت ہوا جب 31 جولائی ۱۹۷۶ کو اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی ہدایت پر (ERL) ''انجینئرنگ ریسرچ لیباٹریز'' کے نام سے ایک خود مختار ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔ اس ادارے کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ پاکستان میں یورینیم کی افزودگی کا پلانٹ قائم کرے جس سے پاکستان ایٹمی قوت حاصل کرے گا۔ اس خود مختار اہم ادارے کے سربراہ محسن پاکستان ڈاکٹر خان تھے۔ یہ ادارہ کسی بھی وزارات، کمیشن یا ایجنسی کے ماتحت نہیں تھا۔ اس ادارے کی خود مختاری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر خان اپنے کام کے حوالے سے صرف اور صرف وزیر اعظم صدر اور آرمی چیف سے رابطہ کرتے تھے۔ تاکہ ایٹمی پروگرام مکمل طور پر محفوظ رہے اس کا اصل کریڈٹ فوج کو ہی جاتا ہے۔

جیسا کہ میں اپنے پہلے باب میں یہ بھی ذکر کر چکا ہوں کہ کے آر ایل کا ایٹمی توانائی کمیشن سے کسی بھی قسم کا کوئی انتظامی یا کسی اور حوالے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تو ذرا آپ خود غور کریں کے پھر کس طرح کچھ کام کے آر ایل اور کچھ کمیشن نے کیا ہوگا۔

اب تو سائنسدانوں اور انجینئروں کے علاوہ عام لوگوں کو بھی اس بات کا علم ہو چکا ہے۔ کہ ایٹم بم بنانے کے لئے سب سے بنیادی اور مشکل کام یورینیم کی افزودگی ہے اول تو پہاڑوں سے کھدائی کر کے یورینیم حاصل کرنا ہی جان جوکھوں کا کام ہے لیکن اس خام مواد کو بہت سے نازک مراحل سے گزار کر اسے بم گریڈ روپ میں ڈھالنا ایک ایسا مشکل کام ہے جس پر دنیا کے صرف پانچ ممالک کو ہی قدرت حاصل ہے۔ دنیا کے سات ایٹمی صلاحیت کے حامل ممالک میں سے صرف پانچ ممالک ہی یورینیم کی آفزودگی کے ذریعے سے ایٹم بم بناتے ہیں۔ یہ عمل پیچیدہ تو ہے ہی تاہم ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے لئے بہت کم خرچ بھی ہے یہی طریقہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک کیلئے موزوں ہوسکتا تھا۔ یہاں میں یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ امریکہ جیسی سپر پاور بھی جوہری ہتھیاروں کی تیاری کے سلسلے میں یورینیم کی افزودگی سے قاصر ہے۔ یورینیم کو افزودہ کرنا کس قدر مشکل

عمل ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پہاڑوں میں کھدائی سے حاصل کیے گئے خام یورینیم میں ایک فیصد سے بھی کم (0.7%) یورینیم ۲۳۵ ہوتا ہے۔ اور یہی کام کی چیز ہوتا ہے۔ چنانچہ اسکی طاقت اور صلاحیت کو بڑھانے کے لئے اسے ایسی مشینوں میں گھمایا جاتا ہے۔ جس کے گھومنے کی رفتار ایک منٹ میں ایک لاکھ چکر ہوتی ہے۔ جب اتنی تیز رفتاری سے گھما گھما کر اسکی طاقت یا افزودگی تین، چار فیصد زیادہ کرلی جائے تو یہ افزودہ یورینیم ایٹمی ری ایکٹر میں بطور ایندھن استعمال کے قابل ہوجاتا ہے۔ اور جب اس یورینیم کو ان انتہائی برق رفتار مشینوں میں گھما گھما کر اسے ۹۰ فیصد یا اس سے بھی زیادہ طاقت ور کر دیا جائے تو پھر یہ یورینیم ۲۳۵ ایٹم بم کے قابل بن جاتا ہے۔

قارئین کرام! جس طرح انڈے کے بغیر آملیٹ نہیں بن سکتا انجن کے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی بجلی یا گیس کے بغیر ہیٹر نہیں چل سکتا بالکل اسی طرح ایٹم بم افزودہ یورینیم ۲۳۵ کے بغیر نہیں بن سکتا۔ اور اس بات کو خود کمیشن کے سائنسدان بھی مانتے ہیں کہ پاکستان کے ایٹم بم میں افزودہ یورینیم ۲۳۵ کا کردار پچاسی فیصد سے لیکر ۹۵ فیصد تک ہے اس حوالے سے میرے پاس ٹھوس شواہد موجود ہیں۔

الغرض یہ سمجھنے کے لئے کہ ۲۸ اور ۳۰ مئی کو ہونے والے پاکستان کے ایٹمی دھماکوں میں کس کا کیا کردار تھا ایک بات تو واضح ہوگئی ہے۔ کہ ان میں سے تقریباً ۹۰ فیصد کردار ایٹم بم گریڈ افزودہ یورینیم کا ہے۔ اور یہ بھی کہ پاکستان میں افزودہ یورینیم محسن پاکستان ڈاکٹر خان کی رہنمائی میں خان ریسرچ لیباٹریز تیار کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ پاکستان تو کیا مذکورہ پانچ ممالک کے علاوہ کسی بھی ملک کا کوئی بھی ادارہ یورینیم کی افزودگی کا دعوی نہیں کرسکتا۔

کے آر ایل کے قیام کے وقت اس کی ذمہ داری صرف یورینیم افزودہ کرنے کی تھی جبکہ باقی مراحل ایٹمی توانائی کمیشن کو طے کرنا تھے۔ جب ڈاکٹر خان اور ان رفقاء نے یورینیم کو افزودہ کر کے پھر اسے گیس میں تبدیل کر کے اور بعد ازاں ٹھوس دھات کی شکل میں لاکر بظاہر ناممکن کام کو ممکن بنادیا۔ تو صدر جنرل ضیاء الحق نے ایک اور اہم فیصلہ کرلیا۔ انہوں نے کمیشن کی مطلوبہ کام کی کارکردگی سے مایوس ہوکر ۱۹۸۲ کے اوئل میں ڈاکٹر خان سے کہا کہ ”کمیشن انہیں مکمل طور پر مایوس کر رہا ہے۔ اور اس امر کا بھی امکان نظر نہیں آتا کہ کمیشن مستقبل ہی میں یورینیم کی افزوگی کے بعد کے مراحل مکمل کرسکے گا۔ اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ کے آر ایل کے دائرہ کار کو مزید بڑھایا جائے“ انہوں نے ڈاکٹر خان کو ہدایت کی کہ اب وہ کمیشن کی ذمہ داریاں بھی اپنے سر لے لیں۔ اس سے اگلے ہی دن لیفٹیننٹ جنرل ضامن نقوی نے بڑے راز دارنہ انداز میں ڈاکٹر خان کو کہا کہ جوہری ہتھیاروں کی ڈرائینگیں اور ڈیزائین بنانے کا کام شروع کردیا جائے۔ ان دنوں وہ کے آر ایل اور جنرل ضیاء کے درمیان پل کا کردار ادا کررہے تھے۔ اور ایٹمی پروگرام کے حوالے سے صدر پاکستان کے انتہائی با اعتماد ساتھیوں میں سے تھے۔ جنرل ضامن نقوی نے یہ بھی کہا کہ یہ تمام کام نہایت رازداری سے کیا جائے اور حکومت کی کسی بھی شخصیت کو اسکی بھنک نہ پڑنے دی جائے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر بلکہ انتہائی قابل فخر بھی کہ ڈاکٹر خان نے دسمبر ۱۹۸۴ میں صدر پاکستان کو اطلاع دی کہ ہم نے جوہری ہتھیاروں کی ڈیزائین اور ڈرائینگیں بھی تیار کرلی ہیں۔ جبکہ کولڈ ٹیسٹ بھی کرلیے ہیں اب حکومت جب چاہیے دو ہفتوں کے نوٹس پر ایٹمی دھماکہ کرسکتی ہے۔ ڈاکٹر خان نے جنرل ضامن نقوی کی موجودگی میں ہی صدر پاکستان کو بتایا کہ ”جناب صدر! میرا کام بالکل پرفیکٹ ہے۔ آپ کو مبارک ہو آج سے آپ ایٹمی طاقت ہیں۔ تو صدر پاکستان نے ڈاکٹر خان کو گلے لگالیا اور ان کا ماتھا چوم کر کہا ”ڈاکٹر صاحب مجھے، افواج پاکستان اور پوری قوم کو آپ پر فخر ہے۔“

قارئین کرام! اب تک حقائق اور قرائن کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کے آر ایل نے اپنے حصے کا نوے فیصد کام کرنے کے بعد بھی ایٹم بم کا ڈیزائن اور ڈرائینگیں تیار کر کے اپنے نوے فیصد کردار کو مزید پانچ، سات فیصد آگے بڑھایا۔ باقی میں یہ ماننے سے بھی بخل سے کام نہیں لوں گا کہ چاغی میں ایٹمی کمروں سے کنٹرول روم تک بچھائی گئی کیبلز اور وہاں دیگر لوہا راتر کھانا کمیشن نے ہی کیا اور یوں کمیشن نے بھی دو، تین فیصد کردار ادا کر لیا۔

قارئین کرام یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ایٹمی دھماکوں کے بعد وطن عزیز کے وزیر اعظم صدر اور تینوں مسلح افواج کے سربراہان کے علاوہ دیگر کئی اہم شخصیات نے شکریہ کے خطوط لکھ کر ڈاکٹر خان کو شکریہ پیش کیا۔ (کچھ خطوط کی نقل کتاب کے آخر میں دی گئی ہے)

کیا آپ کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/مصنف/مولف ہیں اور اپنی کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں تو ملک کے معروف پبلشرز "علم و عرفان پبلشرز" کی خدمات حاصل کیجئے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفین اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب ٹائٹل اور اغلاط سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک......
کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میٹر (مواد) دیجئے اور کتاب لیجئے......

خواتین کے لیے سنہری موقع......سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق......

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسا پبلشنگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/مصنفین کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں......

عمیرہ احمد	ماہا ملک	فرحت اشتیاق	رخسانہ نگار عدنان	قیصرہ حیات	انجم انصار
نازیہ کنول نازی	نگہت عبداللہ	رفعت سراج	نبیلہ عزیز	نگہت سیما	میمونہ خورشید علی
اقراء صغیر احمد	ہاشم ندیم	طارق اسماعیل ساگر	ایم۔اے۔راحت	اعتبار ساجد	شیما مجید (تحقیق)
محی الدین نواب	علیم الحق حقی	امجد جاوید	جاوید چوہدری	ایس۔ایم۔ظفر	

مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور ilmoirfanpublishers@yahoo.com

کتاب گھر کی پیشکش http://kitaabghar.com

باب ششم

اسلامی بم کے خالقوں کے اثاثے

۱۔ ٹمبکٹو میں ''ڈاکٹر خان کے ہوٹل'' کی حقیقت

۲۔ ڈاکٹر خان اور انکے ساتھیوں کے مالی اثاثوں کی حقیقت

۳۔ ڈاکٹر خان کے اثاثے

۴۔ ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر خان دیگر ساتھیوں کے اثاثے

اسلامی بم کے خالقوں کے اثاثے

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

ٹمبکٹو میں ''ڈاکٹر خان کے ہوٹل'' کی حقیقت

ڈاکٹر خان کی شخصیت کو داغدار کرنے کے لیے ان پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر خان نے ہالینڈ میں اپنی بیوی ہینی خان کے نام ٹمبکٹو میں ایک فائیو سٹار ہوٹل بنایا ہے۔ جو انہوں نے قوم کی لوٹی ہوئی دولت سے بنایا ہے۔ اس ہوٹل کا حوالہ دیکر ڈاکٹر خان کی عزت کو بدنام کرنے کے لیے بہت ڈرامے رچائے گئے۔ لیکن عوام نے ایسی کسی بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ اگر واقعی ہی کوئی ہوٹل ہے تو انہیں کیوں اعتراض ہے ڈاکٹر خان کے کارنامے کے سامنے تو یہ سب کچھ ہیچ ہے۔ لیکن میں آپ کو اس ہوٹل کی اصل حقیقت سے آگاہ کرنا چاہوں گا۔ محسن پاکستان ڈاکٹر خان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ انتہائی رحمدل ہیں اور ضرورت مندوں کی مدد میں بہت پہل کرتے ہیں۔ ہوا یوں کہ ڈاکٹر خان جب ایک مرتبہ اپنے چند ذاتی دوستوں کے ساتھ ٹمبکٹو کی سیاحت کے لیے گئے تو وہاں پر انہوں نے ایک عبدالرحمٰن نامی شخص کی بطور گائیڈ خدمات حاصل کیں۔ دوران سیاحت ڈاکٹر خان نے اندازہ لگایا کہ عبدالرحمٰن انتہائی غریب ہے اس کی کچھ مدد کرنی چاہیے۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے بھی اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے ڈاکٹر خان کی بات پر صاد کیا۔ اس حوالے سے میں اور برادرم عبداللہ گل نے ڈاکٹر خان سے بھی دریافت کیا تو ڈاکٹر خان صاحب نے بتایا کہ عبدالرحمٰن دراصل بہت غریب تھا اس کو بواسیر کا مرض بھی تھا پہلے تو میں نے اسے اپنی طرف سے ویزہ بھیج کر پاکستان بلوایا اور کے آر ایل ہسپتال میں اس کا علاج کروایا۔ اس دوران میں نے عبدالرحمٰن سے پوچھا کہ وہاں پر زمین کے کیا ریٹ ہیں تو اس نے مجھے بتایا کہ 70x35 میٹر کا پلاٹ 2000 ڈالر میں ملے گا۔ اس سلسلے میں میں نے ہالینڈ میں اپنے ایک دوست ہینک کراچی والے میاں فاروق، دبئی کے حاجی رزاق اور طاہر سے پانچ پانچ ہزار ڈالر جمع کر کے 10۔2AC ڈیپ فریزر 2 فریجیں ۲ ڈنر سیٹ اور کچھ دیگر برتن بھیج دیے جبکہ باقی رقم جگہ خریدنے اور تعمیری کام کے آغاز کے لیے ساتھ دے دیے یوں اس نے اپنا ہوٹل بنوالیا۔ جب ہوٹل چلنے لگا تو اس نے اسے میری اہلیہ کے نام موسوم کر دیا۔ بس یہی ہے اس ہوٹل کی حقیقت''

قارئین کرام! آپ اندازہ لگائیں کہ کس طرح ان لوگوں نے اس ہوٹل کا ہوا کھڑا کر کے ڈاکٹر خان کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ لیکن فتح ہمیشہ سچ کی ہی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر خان اور ان کے ساتھیوں کے مالی اثاثوں کی حقیقت

کھوٹہ دشمن لابی کے ان ناعاقبت اندیش چہروں نے محسن پاکستان اور ان کے ساتھیوں پر جو الزامات عائد کیے ہیں ان میں سے یہ بھی ہیں کہ ڈاکٹر خان کا قبضہ مافیا سے تعلق ہے۔ اسلام آباد میں ان کی ۲۲ جائیدادیں ہیں۔ بیرون ممالک میں بھی ان کی بھاری پراپرٹی ہے۔ ان کے انڈر ورلڈ

مافیا اور سونے کے تاجروں سے تعلقات ہیں۔ انکے بیرون ملک کئی بنک کاؤنٹس ہیں۔ انہوں نے مالی بے ضابطگیاں کیں جو ثابت ہوگئیں۔ آیئے ذرا آستین کے سانپوں کے ان الزامات کا جواب بھی سنیں۔ سب سے پہلے تو میں ڈاکٹر خان کی ذات پر لگائے گئے الزامات کے حوالے سے ان کی پراپرٹی کے حوالے سے چند حقائق آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر خان کے اثاثے

ڈاکٹر خان کا ناطہ جن بنگلوں، پلاٹس اور بنک اکاؤنٹس سے جوڑا جاتا ہے سچ تو یہ ہے کہ ان میں کوئی حقیقت نہیں۔ جیسا کہ ابتدائی باب میں یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ ڈاکٹر خان ہالینڈ میں پر تعیش تنخواہ اور سہولیات کو چھوڑ کر یا معمولی سی تنخواہ کے عوض کام کرنے پر راضی ہوئے۔ اور یہ بات ان کے جذبہ حب الوطنی کی دلیل ہے اول دن سے لیکر آخر تک ڈاکٹر خان جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہوکر ہی یہ تمام کام کرتے رہے۔ ان کے وطن عزیز میں صرف دو گھر ہیں ایک بنی گالہ سکیم میں اور دوسرا اسلام آباد کے سیکٹر ای سیون میں واقع ہے۔ ای سیون میں واقع گھر کے حوالے سے یہ پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ یہ ڈاکٹر خان کا محل ہے۔ حالانکہ اگر آپ اس گھر کو دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ گھر وہاں واقع تمام گھروں کی نسبت ایک عام سا گھر ہے۔ ڈاکٹر خان جب ہالینڈ سے وطن واپس آگئے تو جن دنوں انہیں کمیشن سے علیحدہ ''پراجیکٹ 706'' کی سربراہی دی گئی تو انہی دنوں انہوں نے ای سیون کا یہ پلاٹ خریدا۔ ان دنوں یہاں آبادی بالکل نہیں تھی بلکہ جنگل ہی جنگل تھا لیکن ایک تو فیصل مسجد کی نزدیکی اور دوسرے پہاڑ کے دامن میں واقع ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر خان کو یہ جگہ پسند آگئی۔ ان دنوں ڈاکٹر خان نے یہ پلاٹ پونے دو لاکھ میں خریدا تھا۔ اور بعد ازاں اسکی تعمیر و تزئین پر تقریباً چھ لاکھ روپے خرچ ہوئے اور اس بات سے تو آپ آگاہ ہی ہوں گے کہ ڈاکٹر خان کے پاس ہالینڈ کی طرف سے ملنے والی تنخواہ سے اتنے پیسے موجود تھے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ جس پلاٹ کو پونے دو لاکھ میں خریدا گیا ہو اور جس کی تعمیر پر چھ لاکھ روپے خرچ ہوئے ہوں وہ ایک درمیانے درجے کا گھر ہوگا یا کہ ان لوگوں کے بقول شاندار محل؟ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ویسے آپ خود اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھیں اور اندازہ لگائیں کہ کہوٹہ دشمن لابی کے ان الزامات میں کس قدر صداقت ہے۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اس گھر میں جو فرنیچر استعمال ہوا وہ اس وقت ستر ہزار روپے میں خریدا گیا اور وہی فرنیچر آج تک زیر استعمال ہے صرف صوفے اور کرسیوں وغیرہ کے پوشش بدل دئے جاتے ہیں، مجھے خود اس تاریخی گھر کو اندر سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے ویسے آپ میری اور برادرم عبداللہ گل کی اس کتاب میں شامل اشاعت ان تصویروں سے اندازہ لگائیں جو اس گھر میں ڈاکٹر خان کے ساتھ کھینچی گئیں کہ یہ کتنا سادہ گھر ہے۔ ان دو گھروں کے علاوہ ڈاکٹر خان کی کوئی جائیداد نہیں ہے نہ ہی انہوں نے اپنی بیٹیوں کو کوئی جائیداد دی ہے۔ بلکہ ڈاکٹر خان کے حالات ایام نظر بندی میں جس طرح گذرے ہیں ان سے میں اچھی طرح واقف ہوں ان حالات کو یہاں ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن سر راہ یہ عرض کرتا چلوں کہ سٹریجک ڈویژن کے سربراہ جناب خالد قدوائی خود ڈاکٹر خان کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ آپ مالی طور پر پریشان ہیں اس کے لئے حکومت آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہے ڈاکٹر خان نے کہا کہ آپ نے تو پہلے ہی میری بہت خدمت کر لی ہے۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر خان نے جناب ایس ایم ظفر کے کہنے پر ان سے وہ رقم غالباً پنشن کی مد میں ایک لاکھ ماہانہ وصول کرنا شروع کر دی۔ آپ خود اندازہ لگائیں کہ اگر ڈاکٹر خان

اتنے بڑے مالدار ہوتے اور اتنے بڑے اثاثوں کے مالک ہوتے تو جس حکومت نے انہیں نظر بند کیا وہ خود کیوں ان سے یہ کہہ کر کہ آپ مالی طور پر پریشان ہیں انکی خدمت کرتی۔

الغرض یہی کہ ڈاکٹر خان کی مذکورہ جائیداد کے علاوہ کوئی پراپرٹی نہیں ہے ہاں اگر ان لوگوں کے پاس کسی ایک کا بھی ثبوت ہے تو سامنے لائیں۔لیکن یہ کبھی بھی ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ ڈاکٹر خان کے پاس کوئی ایسی جائیداد سرے سے ہے ہی نہیں جسکا انہوں نے طوفان کھڑا کر رکھا تھا۔

قارئین کرام! اب میں آپ کی خدمت میں ڈاکٹر خان کے ساتھیوں کی طرف سے لگائے گئے الزامات کا جواب دینا چاہوں گا اس حوالے سے انکے سب سے قریبی رفیق کار جناب نذیر احمد کے حالات درج کرنے پر ہی اکتفا کروں گا ویسے اگر ہم ڈاکٹر خان کے تمام رفقاء کے حالات لکھنے لگیں تو اس کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی۔

ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر خان کے دیگر ساتھیوں کے اثاثے

ڈاکٹر نذیر احمد انتہائی قابل شخصیت ہیں، مجھے ڈاکٹر نذیر احمد سے ایک دو ملاقوں کے بعد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کہوٹہ کے لئے ایسے ہونہار قابل، محنتی اور حب الوطنی سے سرشار سائنسدانوں کا انتخاب بھی بلاشبہ محسن پاکستان کا ایک عظیم کارنامہ ہے ورنہ اگر کے آر ایل میں بھی خدانخواستہ کیشن جیسے لوگ (ویسے ان میں کچھ اچھے لوگ بھی تھے) ہوتے تو آج وطن عزیز ایٹمی طاقت کبھی بھی نہ بن پاتا۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے ایف ایس سی اسلامیہ کالج لاہور سے اعلیٰ پوزیشن میں پاس کی۔ بعدازاں اعلیٰ فرسٹ ڈویژن سے انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد آپ مختلف جگہوں پر کام کرتے رہے اور بیرون ممالک تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ڈاکٹر نذیر ان دنوں امریکہ میں زیر ملازمت تھے کہ جب انہیں کے آر ایل کی طرف سے آفر ہوئی۔اور وہ کے آر ایل کے ٹکٹ پر ہی اپنی فیملی (پانچ افراد) کے ساتھ وطن واپس آ گئے اور یوں ۲۶ ستمبر ۱۹۸۳ میں انہوں نے کے آر ایل میں ایک پرنسپل انجینئر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کا آغاز رہا۔ بعد ازاں ڈاکٹر نذیر کے آر ایل کے ایک شعبہ کے ڈائریکٹر جنرل بھی رہے۔

کہوٹہ دشمن لابی نے ان پر وہی الزامات عائد کئے تھے کہ جو ڈاکٹر خان اور انکے دیگر ساتھیوں پر کئے گئے تھے لیکن حقیقت کیا ہے آیئے میں آپکو آگاہ کروں۔ڈاکٹر نذیر احمد جب وطن واپس آئے تو ان کے پاس امریکی ملازمت کے کچھ پیسے تھے جس سے انہوں نے ایک پلاٹ اسلام آباد میں خرید لیا۔ یہ پلاٹ انہوں نے امریکہ میں ملازمت کے دوران خریدا تھا۔ جب آپ امریکہ چھوڑ کر کے آر ایل آئے تو چند سالوں بعد انکی اہلیہ کو بھی والدین کی طرف سے حصے میں کچھ زمین ملی جو لاہور میں تھی۔ڈاکٹر نذیر احمد اپنے اسلام آباد والے پلاٹ پر گھر تعمیر کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے پاس پیسے کم تھے مجبوراً انہیں ایک بنک سے قرضہ لینا پڑا اور وہ بھی بڑی مشکل ادا کیا گیا۔اب آپ اندازہ کریں کہ اگر ڈاکٹر نذیر احمد نے واقعی کوئی مالی بے ضابطگی کی ہوتی تو کیا وہ اپنا گھر بنانے کیلئے بنک سے قرضہ لیتے...؟؟ اور پہلے دن سے لیکر آج تک ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے گھر کا پہلا پورشن کرائے پر دیا ہوا ہے اور خود اوپر والے پورشن میں رہنے پر مجبور ہیں۔ اندازہ لگائیں ایک آدمی اپنے اور اپنی بیوی بچوں کے اخراجات پورے کرنے کے لئے اپنے گھر کا آدھا حصہ کرائے پر دئے ہوئے ہے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ رشوت خور اور قوم کا پیسہ لوٹنے والے لوگ ہیں میرا دل تو

چاہتا تھا کہ آپ کو کے آر ایل میں کام کرنے والے ڈاکٹر خان تمام رفقاء کے حالات سے آگاہ کروں لیکن صفحات کی کمی کے پیشِ نظر ایسا کرنے سے قاصر ہوں۔

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش

قارئین کرام! حقیقت میں یہی وہ محترم شخصیات ہیں جن کی وجہ سے آج ہم سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہوئے ہیں۔اور یہ سب کے سب ہمارے قومی ہیروں ہیں ان سے انکا یہ اعزاز کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔

http://kitaabghar.com

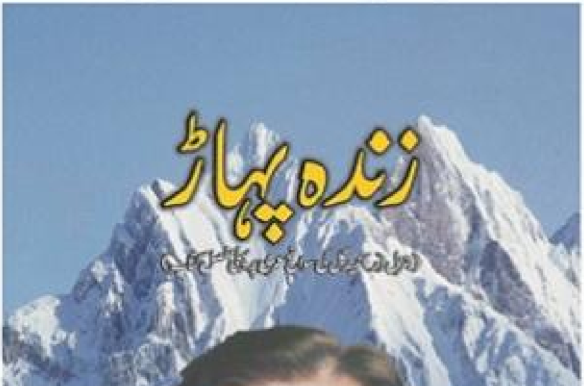

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

باب ہفتم

پتھر بولتے ہیں

1 غلام اسحاق خان کا تاریخی خط

2 جناب آغا شاہی کا اعتراف

3 محسن پاکستان کی خدمات کے اعتراف میں پرویز مشرف کی تقریر

4 قدرت کا انتقام

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

پتھر بولتے ہیں

معزز قارئین! قومی ہیرو، ہیرو ہی ہوتے ہیں۔ تاریخ اسلام ایسے ہزاروں واقعات سے بھری پڑی ہے۔ کہ جن میں اپنے ہیروز کی کردار کشی کی گئی۔ لیکن پوری امت مسلمہ آج بھی اپنے ہیروز کی قدر دل میں بٹھائے بیٹھی ہے۔ ہمیں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں آپ حضرت علامہ محمد اقبال اور حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی مثال لے لیجئے۔ آج بھی اس ملک میں ان کی کردار کشی کرنے والے موجود ہیں۔ لیکن کوئی انہیں منہ لگانے کو تیار نہیں بلکہ سب یہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ بھارتی ٹکڑوں پر پلنے والے ہیں۔ اور اپنے راشن پانی کے لئے اپنے آقا بھارت کی فرمانبداری کر رہے ہیں۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو محسن پاکستان اور ان کے رفقاء پر الزام تراشی کرتے ہیں۔ زیر نظر باب میں' میں اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کروں گا کہ ان ٹٹ پونجیوں کے الزامات کا جواب کے آر ایل سے وابستہ قومی ذمہ داران کی زبان سے دوں۔ اور ان ہی کی طرف سے یہ بھی واضح کروں کہ ایٹم بم بنانے میں کے آر ایل کا کس قدر کردار تھا۔ اور نیز کیا کے آر ایل میں بے حساب پیسے کا ضیاع ہوا۔؟؟ کیا واقعی ڈاکٹر خان نے سات ارب روپے خرد برد کر لئے؟؟ اس حوالے سے میں سابق آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ کے ۲۳ اپریل ۱۹۹۴ کو "دی نیوز" میں شائع ہونے والے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔ اور آپ اس بات سے تو آگاہ ہی ہیں کہ جنرل اسلم بیگ ایٹمی پروگرام سے بطور آرمی چیف ذاتی طور پر وابستہ رہے ہیں۔ آیئے ان کے مذکورہ مضمون کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"1986'1987'1988 میں کہوٹہ پروجیکٹ جب انتہائی عروج پر تھا تو اس کا سالانہ بجٹ ایک ایف 16 طیارے کی قیمت سے بھی کم تھا ہم نے ایک طیارہ کے لئے 18 ملین ڈالر کی بجائے ۲۸ ملین ڈالر فی طیارہ ادا کئے کیونکہ ہم اپنی باری سے پہلے طیارے لینا چاہتے تھے۔ اس لئے ہمیں ہر طیارے کیلئے ۱۰ ملین ڈالر زیادہ ادا کرنے پڑے۔ اشارہ ۲۸ ملین ڈالر کی طرف نہیں بلکہ ۱۸ ملین فی طیارے کی طرف ہے میں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ کہوٹہ پروجیکٹ کا سالانہ بجٹ ایک ایف 16 طیارے کی قیمت سے بھی کم تھا۔ جبکہ ۳۸ طیاروں میں سے چار پانچ جلد ہی تباہ ہو گئے اسلئے جو کہوٹہ کا متبادل روایتی جہازوں کو قرار دیتے ہیں وہ اس پہلو سے ناآشنا ہیں"۔

پھر یہی جنرل مرزا اسلم بیگ ۲۷ جنوری ۲۰۰۴ کو ایک مضمون لکھتے ہیں یاد رہے یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب ڈکٹیٹر پرویز مشرف محسنان پاکستان کی توہین کر رہا تھا۔ جب اس بدبخت نے امریکی ایما پر قومی ہیرو کی توہین کی انکی ڈی بریفنگ شروع کی۔ انہیں طرح طرح کی اذیتوں سے دوچار کیا۔ پرویز مشرف کے مظالم سے پوری قوم آگاہ ہے یہی وجہ ہے وہ آج دردر کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ انہی دنوں جب محسنان پاکستان پر کرپشن کے الزامات لگائے جا رہے تھے تو جنرل اسلم بیگ کا یہ مضمون شائع ہوا جس کے اقتباسات سے میں آپکو آگاہ کرنا چاہوں گا جنرل اسلم بیگ لکھتے ہیں۔

"معاملے کو جس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا وہ محکموں کے درمیان رقابت حسد اور دشمنی کا نتیجہ ہے۔ کے آر ایل اور اٹامک نرجی کمیشن

کے نام سے دو مختلف ادارے ہیں کے آر ایل کو جو فنڈ ملتے تھے ان کا آڈٹ نہیں ہوتا تھا اٹامک انرجی کمیشن کا آڈٹ ہوتا تھا۔ اس نے دونوں میں عناد پیدا کر دیا اٹیمی کمیشن والے نہیں چاہتے تھے کہ کے آر ایل والوں کو کیک ملیں جسے وہ کھائیں بھی جب تک جنرل ضیاء انچارج رہے اس رقابت کو کنٹرول میں رکھا گیا، اس کے بعد لوگ پھٹ پڑے اور الزام تراشی کرنے لگے۔ قدیر خان کیخلاف فرضی کہانیاں گھڑ لیں جن میں بڑی جاذبیت نظر آتی تھی۔ جب جنرل پرویز مشرف اقتدار میں آئے یہ کہانیاں پھیلی ہوئی تھیں کہ ڈاکٹر قدیر اوران کے ساتھی سائنسدانوں نے اس رقم سے جو انہیں دی گئی تھی ایمپائرز بنالیں۔ ان میں سے بعض کہانیاں اخبارات میں بھی آئیں اور کہا گیا جنرل پرویز مشرف کو یہ سب کچھ بتا گیا تو وہ پریشان ہو گئے، شاید حکومت سمجھتی ہے کہ ڈاکٹر خان نے فنڈز کا غلط استعمال کیا یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر قدیر کو بھاری رقوم کام کرنے کے لئے دی گئی تھیں۔ انہوں نے کام کر کے دکھایا۔ آپ ہر پائی کا حساب تو نہیں دے سکتے''

میں نیوکلیئر کمان اتھارٹی کا رکن تھا' اور اسکے سالانہ اجلاس میں شریک تھا جہاں بجٹ پر غور ہوا' اس میں اے کیو خان کو دیئے گئے بجٹ کی بیلنس شیٹ کی چیف ایگزیکٹو نے منظوری دی' ہر چیز کا حساب ہوا' اتنی رقم دی گئی اتنا افزودہ یورنیم تیار ہوا۔ ڈاکٹر قدیر اوران کے ساتھی سائنسدانوں نے معمولی رقم کے عوض ملک کو قابل اعتماد ڈیٹرنٹ دیا ہے ان کے اکاؤنٹس میں جو کچھ ہے۔ میں اسے سونے کا برادہ قرار دیتا ہوں انہوں نے حکومت کا پیسہ نہیں لیا۔ اگر کسی سائنسدان کو دس ملین ڈالر سامان کی خریداری کے لئے دیئے گئے وہ اس رقم کو اپنے بینک میں نہیں رکھے گا۔ کچھ عرصہ یہ رقم اس کے اکاؤنٹ میں پڑی رہے گی۔ تو جتنا عرصہ یہ رقم اس کے اکاؤنٹ میں پڑی رہے گی اس کا مارک اپ بھی اس کے اکاؤنٹ میں جائے گا۔ ہو سکتا ہے اور منطقی بات ہے کہ کوئی شخص اس سائنسدان سے رابطہ کر کے کہے کہ اے آر وائی گولڈ والے علاقے میں سونے کی قیمتوں پر نظر رکھتے ہیں۔ آپ کیوں ان ملین ڈالروں کی سرمایہ کاری نہیں کرتے جب ضرورت ہو اپنی رقم لے لیجئے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہوا ہو کیا ایسا کرنا جرم ہے؟ بالکل نہیں۔ حکومت بڑے غلط طریقے سے معاملے کو لے رہی ہے اور محکموں کی آویزش میں وہ فریق بن گئی ہے۔ اور سمجھتی ہے کہ سائنسدانوں نے راز بیچے ہیں''

آپ جنرل اسلم بیگ کے اس نقطہ نظر کے حوالے سے یقیناً آگاہ ہو چکے ہیں پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر پیسے کا قطعاً کوئی ضیاع نہیں کیا گیا۔ بلکہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام دنیا کا واحد ایسا پروگرام ہے جس پر سب سے کم لاگت آئی ہے۔

یہ ہمارا قومی المیہ ہے کہ وہ لوگ جو ایٹمی سائنس کی ا،ب سے بھی واقف نہیں۔ آج ڈاکٹر خان کی شخصیت پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ ڈاکٹر خان نے قوم کو وہ کچھ دیا جو اسکے پاس پہلے نہیں تھا۔ جو قوم اپنا پیٹ کاٹ کر ایٹمی پروگرام کے لئے وسائل فراہم کرتی رہی ہے وہ اتنی بھی بے وقوف نہیں ہے کہ اپنے محسن کی کردار کشی کرنے والوں پر یقین کرے۔ اور بے بنیاد اور گھٹیا پروپیگنڈہ کو مان لے۔ وہ بھی ایسے لوگوں کی طرف سے کہ جن کا معاشرے میں نہ کوئی وقار ہے۔ اور نہ ہی ان کے پڑھے لکھے ہونے کا کوئی اعتبار ہے۔ البتہ یہ قوم ان کے کردار کے باعث اپنے عظیم ہیرو کے سامنے شرمندہ ضرور ہے۔

ڈاکٹر خان کی تذلیل کرنے والے نہ جانے کیوں بھول جاتے ہیں کہ لوگ جس سے محبت کرتے ہوں اسکی خامیوں پر توجہ نہیں دیا کرتے اور نہ ہی ہمارے معاشرے میں محبت میں کوئی حساب کتاب ہوتا ہے۔

قارئین! یہاں میں اپنے نظریے کو واضح کرنے کے لئے سابق صدر پاکستان جناب غلام اسحاق خان کا وہ تاریخی خط شائع کروں گا جو انہوں نے جناب زاہد ملک کو لکھا۔ آپ اس مذکورہ خط سے ایٹمی پروگرام میں جس کسی کا بھی کردار ہے اس کی اصل حقیقت جان پائیں گے۔

غلام اسحاق خان کا تاریخی خط:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام اسحاق خان

صدر، سوسائٹی فار پروموشن آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی،

صدر بورڈ آف گورنرز، جی آئی کے انسٹی ٹیوٹ،

سابق صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان

محترم زاہد ملک صاحب!

آپ کے مکتوب کا شکریہ جس میں آپ نے ڈاکٹر اے کیو خان کی شخصیت' امتیازی اوصاف' خدمات کامیابیوں اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے میرے قریبی تعلق کے باعث بحیثیت انسان اور سائنسدان ان کی زندگی کے ان اچھوتے پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے کہا ہے۔

''میں بلاشبہ اپنی مختلف سرکاری حیثیتوں میں ڈاکٹر خان کے کام اور کارناموں سے عملی طور پر مسلسل دو عشرے سے بھی زیادہ عرصہ متعلق رہا ہوں۔ ہمارے تعارف کے ابتدائی دنوں ہی میں میں نے انہیں ایسا فرد پایا' جو زندگی کو عظیم اور نیک مشن کے لئے وقف کر چکا ہے۔ ایسے مشن کے لئے جو اگرچہ مشکل ضرور تھا لیکن جسے عزم و ہمت کے فرد کے لئے اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا ناممکن نہیں۔ بعد کے دنوں میں' میں نے دیکھا کہ انہوں نے خود کو پورے عزم و ایقان اور تندہی کیساتھ اس منزل کے حصول کے لئے وقف کر رکھا ہے جو انہوں نے اپنے لئے خود متعین کی ہے۔ آج بھی یاد ہے کہ اپنے باقاعدہ ماہانہ اجلاسوں میں جب ہم ان کی پیش رفت اور طے کردہ سفر کے بارے میں سنتے تو بہت خوش ہوتے اور یہ دیکھ اور جان کر فخر و مسرت محسوس کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کس طرح ان اوصاف ان صلاحیتوں اور مہارتوں سے نوازا ہے جن کی بدولت وہ اپنے راستے کی مشکلات اور رکاوٹوں کو دور کرتے چلے جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ''ایک ادارہ ایک شخص کے سائے کا پھیلاؤ ہوتا ہے اور سائے کا پھیلاؤ ان تقرریوں' تعینات اور ترقیوں سے متاثر ہوتا ہے جو وہ کرتا ہے اور جو نئے تصورات کے اختراع کا ذریعہ بنتی اور اس شخص کو اپنے پروگرام پر عملدرآمد کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔'' عملی طور پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو آگے بڑھانے اور تکمیل تک پہنچانے کا چیلنج قبول کیا' ان کا پہلا کام کہوٹہ لیبارٹریز کے قیام کے ذریعہ اپنے مشن کی تکمیل کیلئے بنیادی ڈھانچے کی فراہمی اور چلانے کیلئے وفادار' قابل اعتماد' بے لوث' ایثار پیشہ اور پیشہ ورانہ طور پر ماہر انجینئروں اور سائنسدانوں کی ٹیم کو جمع کرنا تھا۔ اور آج کے آر ایل ہمارا ایک انتہائی اہم ادارہ بن چکا ہے جو دفاعی پیداوار اور ریسرچ کے میدان میں دنیا کے چند بہترین اداروں کے ہم پلہ ہے۔ یہ بنیادی طور پر یورینیم کے ہتھیاروں کی سطح تک افزودگی کے لئے قائم کیا گیا تھا اور اسے حسن اتفاق کہیے کہ یہ ان

اداروں کے مقابلے میں جو بعض ممالک نے اسی مقصد کے لئے انہی دنوں قائم کئے تھے۔ نہایت ارزاں لاگت میں تیار ہوا۔ آج یہ نہ صرف یورینیم کی افزودگی کے لئے درکار تنصیبات جدید ترین ورکشاپوں سازوسامان اور دیگر سہولتوں پر مشتمل ہے جو بعض متعلقہ یا ملحقہ اداروں کی الگ عمارات میں واقع ہیں بلکہ مقامی طور پر (بشمول غوری) میزائلوں' اینٹی ٹینک آلات' ملٹی بیرل گنز اور تاریکی میں دیکھنے والے آلات وغیرہ سمیت ہر قسم کے جنگی ہتھیاروں کی مقامی طور پر تیاری اور پیداوار کی تنصیبات پر محیط ہے۔ ڈیفنس ٹیکنالوجی میں خود کفالت کے حصول کی طرف یہ پہلا قدم تھا اور اس طرح کے آر ایل نے ڈاکٹر خان کی عظیم قیادت میں ملکی دفاع اور سلامتی کو ناقابل شکست بنانے میں لازوال کردار ادا کیا۔

کے آر ایل کو موجودہ مقام تک پہنچانے میں اس کے معماروں کو حقیقی معنوں میں زبردست چیلنج کا سامنا تھا انہیں ایسے فنی مسائل کو حل کرنا تھا جن سے انہیں پہلی مرتبہ واسطہ پڑا اور انہیں انسانوں کی پیدا کردہ مشکلات اور قدرتی آفات پر قابو پانا تھا۔ یورینیم کی افزودگی میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جہاں سنٹری فیوجز نے ان میں استعمال ہونے والی قدرتی گیس کو ایک حد سے آگے افزودہ کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ انتہائی کٹھن مرحلہ تھا ایسا کیوں ہوا؟ اس پر تحقیقات کی گئی اور اس مشکل کو حل کر لیا گیا۔ پھر گاہے بگاہے بعض انتہائی نازک مراحل میں انتہائی ضروری آئٹمز کی فراہمی پر پابندیاں لگائی جاتی رہیں' حالانکہ ان کے منگوانے پر اصولاً کوئی پابندی نہ تھی۔ اور ان کے لئے کھلے عام معاہدے کئے گئے تھے بلکہ قیمت بھی ادا کی جا چکی تھی۔ ایسی صورت میں بعض پرزہ جات کی مقامی طور پر تیاری کا فیصلہ کی گیا۔ اس کے لئے تجربات اور آزمائش کے مراحل میں کئی غلطیاں ہوئیں یا پھر ریورس انجینئرنگ کے طویل عمل کا طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ پھر یہ کم از کم تین مرتبہ انتہائی نازک اور تیز رفتار جھٹکوں اور بڑی مشکل سے ترتیب دی گئی سینکڑوں سنٹری فیوجز کی صفوں کو غیر متوقع زلزلوں کے شدید جھٹکوں نے درہم برہم کر کے رکھ دیا (حالانکہ کہوٹہ ریجن میں ایسے زلزلوں کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے) ان کو وقت اور محنت کی بھاری لاگت سے دوبارہ ترتیب اور منظم کرنا پڑا۔ اندریں حالات کوئی اور شخص جو ڈاکٹر خان جیسے ناقابل شکست عزم اور مستقل مزاجی سے متصف نہ ہوتا دل چھوڑ بیٹھتا۔ لیکن ان حادثات نے ڈاکٹر خان کیلئے مہمیز کا کام دیا اور انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ تندہی اور محنت کے ساتھ کام کیا اس کے نتیجے میں نہایت مختصر وقت میں ان عفریت آسا نقصانات کا ازالہ کر لیا گیا بلکہ آخری سانحہ کے بعد تو مزید مستحکم لنگر کی فراہمی سے مشینوں کے ڈیزائین کو بہتر بنایا گیا اور یوں عملاً انہیں مستقبل کے بھونچالی جھٹکوں سے محفوظ بنا دیا گیا۔ آج کے آر ایل او راس کے متعلقہ ادارے اس کے معمار کی بصیرت' دوراندیشی' محنت شاقہ اور حب الوطنی کی ایک روشن یادگار کی صورت سرگرم عمل ہیں۔ یہ اس امر کی بھی روشن دلیل ہیں کہ اگر مواقع مہیا کئے جائیں تو محدود وسائل کے باوجود ذرا سی حوصلہ افزائی اور پرخلوص اور بے لوث قیادت کے ذریعہ خوابوں کو حقیقت کا روپ دیا جا سکتا ہے۔

قوم اپنے سائنسدانوں اور انجینئروں کی ممنون احسان ہے کہ جنہوں نے فنی طور پر انتہائی بے مایہ اور پسماندہ ملک کو دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت بنا دیا اس انقلابی تبدیلی لانے میں میرے نزدیک سب سے اہم اور فیصلہ کن کردار ڈاکٹر خان اور ان کے ادارے کا ہے۔ کے آر ایل کے تیار کردہ افزودہ یورینیم کو بطور ایندھن استعمال کر کے انہوں نے ۱۹۸۴ کی دہائی کے دوسرے نصف میں ایک ایٹمی ہتھیار تیار کیا جسے انتہائی مختصر نوٹس پر جوڑا اور داغا جا سکتا ہے۔ بعض بیرونی ملکوں نے جو عالمی سطح پر ایٹمی عدم پھیلاؤ کے ایجنڈے پر سختی سے عمل پیرا ہیں اس کا سخت نوٹس لیا اور ان کے

''امام'' نے وطن عزیز کو ان کے اجارہ دارانہ سٹریجک منصوبوں کی کھلی تضحیک کرتے ہوئے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے ''گناہ'' کی سزا دینے کا فیصلہ کیا چنانچہ ۱۹۹۰ میں پاکستان پر اقتصادی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اور فوجی امداد اور اقتصادی معاونت جس کا اعلان بھی کیا جا چکا تھا مکمل طور پر معطل کر دی گئی۔ حالانکہ افغانستان کے المیہ کے دنوں سے ہماری معیشت بتدریج مکمل طور پر غیر ملکی امداد پر منحصر ہو کر رہ گئی تھی۔ تاہم ملکی سطح پر ''ایٹمی ہتھیار کا حامل'' ہونے کے الزام کی کبھی سرکاری سطح پر ذمہ دارانہ تصدیق نہ کی گئی اور ملکی پالیسی کے طور پر اس کے گرد جان بوجھ کر ابہام قائم رکھا گیا۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ قدرتی طور پر اپنی کامیابیوں اور فتوحات کا اعتراف چاہتی ہے اور چونکہ سرکاری پالیسی کے طور پر اس اعتراف میں بخل سے کام لیا جا رہا تھا اسلئے اس سے ان لوگوں میں مایوسی پیدا ہونے لگی تھی جنہوں نے سالہا سال تک اس ہتھیاروں کے لئے انتھک اور بے لوث کام کیا تھا۔ اور وہ اس کھلے اعتراف کے متمنی اور منتظر تھے۔ دوسری طرف ''ٹھوس ثبوت'' کے فقدان کی پالیسی نے ان لوگوں کے ذہنوں میں بھی شکوک وشبہات کو جنم دیا جو ڈاکٹر اے کیو خان کی قیادت میں جاری ایٹمی پروگرام سے پوری طرح باخبر نہ تھے چنانچہ ان عناصر نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ سب ''فریب'' اور تشہیر ڈراما'' ہے۔ اور اس قسم کا کوئی ہتھیار تیار نہیں کیا گیا اور اس کا کوئی وجود نہیں حالانکہ وہ اپنے تجربے کی بناء پر بخوبی آگاہ تھے۔ کہ ڈاکٹر خان نے کبھی ایسا وعدہ نہیں کیا جس سے وہ کچھ دنوں بعد منحرف ہو جائیں۔

بالآخر شک وشبہ کے یہ بادل ۲۸ مئی ۱۹۹۸ کو چھٹ گئے کہ جب ایک نہیں بلکہ کئی ایٹمی ہتھیاروں کا بلوچستان کی چاغی ہلز میں کامیاب تجربہ کیا گیا اور متشکک عناصر کو شرمندگی اٹھانا پڑی۔ ان تجربات کی بین الاقوامی طور پر تصدیق کی گئی اور اس کمال کے حقیقی اعتراف کا ایک سیلاب آ گیا۔ سرکاری اور غیر سرکار دونوں سطح پر اعزازات' انعامات' میڈلز اور پرائز دیئے گئے۔ ثنائیہ اور تہنیتی ریفرنسز اور تحسینی تقریبات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور فنی اداروں اور فاؤنڈیشن کو ڈاکٹر خان سے موسوم کیا جانے لگا اس کا نتیجہ ہے کہ آپ ڈاکٹر عبد القدیر خان وطن عزیز کے سب سے زیادہ اعزاز یافتہ شہری اور دنیا بھر میں بالخصوص سائنسی برادری میں سب سے معروف شخصیت ہیں۔

بدقسمتی سے ان دھماکوں نے ''بم ٹیکنالوجی'' کے حصول میں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن اور کے آر ایل اور ان سے متعلقہ سائنسدانوں اور انجینیئروں کے حصے اور کردار کے بارے میں ایک فضول اور قطعاً نامناسب بحث کو جنم دیا۔ اس بحث میں کریڈٹ لینے کے نئے نئے آرزومندوں اور مدعیوں نے جو دلائل دیئے وہ بالخصوص ہم جیسے لوگوں کی طبعیت پر نہایت بار گزرے جو دونوں اداروں کی سرگرمیوں سے متعلق رہے تھے (دونوں ادارے اپنی جگہ درجہ اول کے ادارے ہیں) اور دونوں کی صلاحیتوں اور دونوں کو تفویض کردہ کام اور ان کی سابق کارکردگی اور کامیابیوں سے پوری طرح واقف تھے۔

یہ بحث شروع ہونے سے ایک دہائی سے بھی پہلے سے غیر ملکی ماہرین' تجزیہ نگار اور پاکستانی امور سے خصوصی دلچسپی رکھنے والے عناصر جانتے اور بلا کسی تردید کے پاکستان کی ایٹمی ٹیکنالوجی کے حقیقی معمار کی نشاندہی کر رہے تھے کہ اس وقت جبکہ ۱۹۷۴ میں بھارت کی ایٹمی دھماکوں کے بعد ری پروسیسنگ پلانٹ اور اس کے متعلقہ سازوسامان کی راہیں پاکستان کے لئے بڑی طاقتوں نے مسدود کر دی تھیں۔ یورینیم افزودگی کے ذریعے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کا منصوبہ کس نے بنایا؟ کس نے ہتھیار سازی کے لئے یورینیم افزودگی کے لئے درکار انتہائی جدید اور پیچیدہ پرزہ

جات اور گیجٹس کی مقامی طور پر تیاری کے پروگرام کی نقشہ کشی کی اور کس نے اسے شروع کیا؟ اور کس کی منفرد ذہنی صلاحیتوں' تن تنہا اور انتھک کوششوں کے ذریعہ ملکی اور غیر ملکی رکاوٹوں اور مشکلات پر قابو پالیا گیا؟ اور کس کا خلوص اور محنت شاقہ بالآخر ۲۸ مئی ۱۹۹۸ کے دھماکوں کی صورت میں ثمر آور ہوئے یہ سب ڈاکٹر اے کیو خان اور کے آر ایل میں ان کی ٹیم کی کوششوں کا حاصل ہے۔

بلاشبہ اس قدر عظیم اور پیچیدگی کا حامل منصوبہ کسی فرد واحد یا ایک ادارے کا کام نہیں تھا دوسروں کو بھی اس میں حصہ دار بننا چاہیے تھا اور پاکستان اٹامک انرجی کمیشن نے یقیناً اس میں خاصا اور قابل ذکر کردار ادا کیا ہے۔ اور اس نے قومی اہمیت کے اس منصوبے میں حب الوطنی کے جذبات سے سرشار تعاون کیا اور اس کے لئے درکار مجموعی محنت اور کام میں اسے تفویض کردہ ذمہ داریوں کو پوری دیانتداری سے نبھایا' تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسری جنگ عظیم میں العالمین کے محاذ پر کامیابی کا کریڈٹ فیلڈ مارشل منٹگمری کی مدبرانہ جنگی حکمت عملی اور قیادت کو دینے کے بجائے اسے اس محاذ کے فیلڈ کمانڈروں' بٹالین لیڈروں' شعبہ جاتی سربراہوں میں حصہ اسلامی تقسیم کرنے کی کوشش کی جائے' جنھوں نے فیلڈ مارشل منٹگمری کو فتح دلانے کیلئے اپنے ذمہ سپلائی' نقل وحرکت یا دوسری معاون خدمات کی فراہمی یا نگرانی کے حوالے انجام دی تھیں۔ یہ بات افسوسناک ہے کہ عام طور پر اس اہم نکتے کو سمجھنے اور اس کی اہمیت کا ادراک کرنے سے گریز کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر خان زندگی کو فعال انداز میں گزارنے کے قائل اور متعدد خوبیوں کے مالک ہیں وہ مشاورت کے قائل لیکن بنیادی اصولوں پر اٹل ہیں۔ وہ زبردست تحریکی قوت کے حامل ہیں' معاملات میں تعویق وتاخیر اور کوئی فیصلہ نہ کرنے کی عادت ان کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ وہ چیلنج قبول کرنے سے نہیں گھبراتے۔ خواہ کام کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو وہ ناممکن کو ممکن بنانے کا عزم اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ لیکن وفاعی تحقیق اور پیداوار ہی ان کا واحد میدان نہیں وہ تعلیم کو عام کرنے' سائنس اور ٹیکنالوجی کو پھیلانے اور شاعری سے لیکر انسانی وسائل کی ترقی اور فلاح تک ان گنت معاملات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ انجینئرنگ' سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کی سوسائٹی (Soprest) کے اساسی ممبر کی حیثیت میں وہ سوسائٹی کے اس فلسفہ پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ اقتصادی ترقی' انسانی بہبود اور قومی سلامتی کے لئے سائنس اور انجینئرنگ کا فروغ ناگزیر ہے۔ نیز غربت میں تخفیف بے روزگاری کے خاتمے اور پیداوار اور پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ کیلئے نئی تکنیکوں کو دریافت اور متعارف کرانے اور پرانی تکنیکوں کے بجائے نئے اور بہتر طریقوں کو رواج دینے کی ضرورت ہے۔

وہ غلام اسحاق انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے بورڈ آف گورنرز کے رکن بھی ہیں جو اپنے اہداف کے حصول کے لئے سوسائٹی کا پہلا ادارہ ہے ڈاکٹر خان نے پروجیکٹ ڈائریکٹر کی حیثیت میں اس ادارے کو سائنس وٹیکنالوجی کا بہترین ادارہ اور ایشیا کی نمایاں فنی یونیورسٹیوں میں سے ایک بنانے میں قابل قدر اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

سب سے آخر میں یہ کہ انہوں نے انسانی وسائل کی ترقی اور بہبود کے اپنے لامتناہی جذبہ صادق کی تسکین اور افرادی وسائل کے مختلف پہلوؤں کے فروغ وبہبود کیلئے ساچٹ (Sochet) کے نام سے ایک نئے ادارے کی نیو اٹھائی ہے اس کا مقصد پاکستان کے کم ترقی یافتہ اور پسماندہ شعبوں میں انسانی وسائل کو ترقی دینا ہے۔ ابتدائی طور پر اس کے لئے انہوں نے تین شعبوں' خواندگی کے فروغ' Geriatric Care اور نسلیاتی

صحت Reproductive Health ' کو منتخب کیا ہے جو موجودہ پاکستان کے عصری تقاضے اور مسائل ہیں۔

میں نے قبل ازیں بھی بعض مواقع پر کہا ہے کہ فضیلت اور عظمت کے معیارات جو انسان اپنی زندگی میں حاصل کرتا ہے ان کا انحصار بعض اسباب اور ان اسباب کا خاندانی نجابت عالی ظرفی اور خلقی سچائی پر ہوتا ہے جنہیں وہ عمر بھر کے لئے اختیار کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر اے کیو خان واقعی ایک ''بہترین'' اور ''عظیم'' شخص ہیں کہ اپنے وطن کی ترقی وعظمت اور اپنے عوام کی بہبود کے لئے کام کرنے سے بہتر کون سا کام ہو سکتا ہے۔ انہوں نے زندگی میں ابتک جو کامیابیاں حاصل کی ہیں اور جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ اپنے بارے میں خود بتا رہے ہیں اور ان الفاظ سے جن میں ان کا ذکر کیا جا سکتا ہے' بلند آہنگ میں بول رہے اور اس محاورے کی صداقت کی شہادت دے رہے ہیں کہ

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

(مشک وہ ہوتی ہے جو خود بخود خوشبو دیتی ہے نہ کہ وہ جسکا دعویٰ عطار کیا کرتے ہیں)

والسلام

غلام اسحاق خان

یونیورسٹی روڈ پشاور

۱۶/اگست ۱۹۹۹ء

قارئین کرام! جناب غلام اسحاق خان کے خط پر میں اپنا تبصرہ کرنے کی بجائے معاملہ آپ پر چھوڑنے پر اکتفا کروں گا۔ اب میں ایٹمی توانائی کمیشن کے ایٹمی پروگرام میں کردار اور ان کی ڈاکٹر خان مخالف کوششوں پر ایک اور اندر کے گواہ سابق وزیر خارجہ جناب آغا شاہی کے مئی ۲۰۰۱ء میں روزنامہ جنگ میں دیئے گئے ایک انٹرویو کا اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔ جناب آغا شاہی بحثیت سیکرٹری خارجہ اور بعد میں وزیر خارجہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیتوں کے سبوتاژ کرنے کے راز دان ہیں: جناب آغا شاہی فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے حسد بہت کیا جاتا تھا۔ اٹامک انرجی کمیشن والے ان سے بہت جلتے تھے اور کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر منیر احمد خان ہمیشہ ان کے خلاف رہتے تھے۔ حالانکہ خود ان کا اس میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ مجھے پروگرام کے حالات کا مکمل علم ہے چار سال تک میں نے نگران بورڈ کے رکن کی حیثیت سے اس پروگرام کی مانیٹرنگ کی ہے۔ شروع میں مجھے یقین نہیں تھا کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام کامیاب ہو گا لیکن ڈاکٹر خان کی عملی کوششوں اور جذبے نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔

''دراصل منیر احمد خان شروع ہی سے ڈاکٹر خان سے خار کھاتے تھے اس لئے میری تجویز پر ڈاکٹر قدیر کا پروجیکٹ الگ کیا گیا اور ایٹم بم بنانے کا سب سے زیادہ کریڈٹ بھی ڈاکٹر خان کو جاتا ہے۔ بھٹو سے اختلافات کے باوجود مجھے یہ اعتراف کرنے میں باک نہیں کہ انہوں نے جس جرات اور بہادری سے اس پروگرام کو چلایا وہ انہی کا حصہ ہے''

آپ اب ان نام نہاد ذمہ داران کی پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف مکروہ سازشوں سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اس

باب کے آغاز میں ذکر کیا ہے کہ یہ باب ایٹمی پروگرام کے حوالے سے اندر کی گواہیوں پر ہی مشتمل ہے۔ آیئے اب جناب آغا شاہی کی تین مارچ ۲۰۰۱ء کو محسن پاکستان ڈاکٹر خان کے اعزاز میں اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں دی گئی ضیافت سے خطاب کے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

جناب آغا شاہی کا اعتراف

''میں سمجھ رہا تھا کہ یہ ضیافت اور تقریب کے آرایل نے ڈاکٹر خان کو الوداع کہنے کے لئے منعقد کی ہے اس لئے جب مجھ سے چند الفاظ کہنے کو کہا گیا تو میں حیران ہوا کہ مجھے کچھ کہنا چاہیے یا نہیں'' پھر مجھے اردو کا یہ مشہور شعر یاد آ گیا۔

کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

ہاں! تو مجھے کہوٹہ پروجیکٹ یعنی یورینیم انرچمنٹ پروجیکٹ کے نگران بورڈ کا ممبر نامزد کیا گیا تھا ۱۹۷۶ء میں مسٹر زیڈ اے بھٹو کے ملٹری سیکرٹری نے مجھے بلایا اور کہا کہ وزیراعظم ایٹمی توانائی کمیشن میں کچھ تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں' اس ضمن میں انہوں نے مجھے کچھ تفصیلات بتائیں پھر میرا مشورہ طلب کیا۔ میں نے کہا کہ موجودہ ایٹمی کمیشن کو نہ چھیڑا جائے۔ اسی طرح کام کرنے دیا جائے البتہ یورینیم انرچمنٹ کا پروجیکٹ ڈاکٹر خان کے حوالے کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

میں نے ''سنٹری فیوج'' کے طریق کار کے بارے میں چند سال قبل ۱۹۶۰ کے عشرے میں سنا تھا جن دنوں میں اقوام متحدہ میں پاکستان کا نائب سفیر تھا' مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ دراصل ایک مشین ہے جو کریم کو نکالنے اور مختلف کثافتوں یا مختلف عناصر کو الگ کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ جب سنٹری فیوج پراسس کے بارے میں بتایا گیا تو اس سے یقیناً اس کے سائنسی اطلاق کی طرف ذہن گیا لیکن ہم سب اس بارے میں متذبذب کہ ہم اس پیچیدہ نامعلوم ٹیکنالوجی پر عبور بھی حاصل کر سکیں گے یا نہیں اور یورینیم کی افزودگی ممکن ہو گی بھی یا نہیں۔ ہمیں یورینیم بھی مل جائے گا اور یورینیم آکسائیڈ بھی تیار کر لیں گے۔ لیکن اسے ہکسا فلورائیڈ پھر اسے ہتھیار سازی کے قابل بنانے کی سطح تک افزودہ کرنے کے بارے میں میرا خیال تھا کہ جان جوکھوں کا کام بلکہ ناممکن ہے۔

میں ڈاکٹر خان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اس وقت تک ان سے ملا بھی نہیں تھا۔ تاہم ہمارے بورڈ کے اجلاس ہوتے رہے جن میں ہمیں پیش رفت کے بارے میں بتایا جاتا ہمارے حوصلے بتدریج بلند ہوتے گئے کہ شاید ہم ایک ناممکن کو ممکن بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ جہاں تک پلوٹونیم کی پیداوار کا تعلق ہے ہم تقریباً اس میں مایوس ہو چکے تھے اس ضمن میں ہمارے تمام منصوبے کراچی کے کینیڈین پلانٹ کے جلے ہوئے ایندھن (Burnt Fuel) کے استعمال پر مبنی تھے یعنی ری پروسیسنگ کے ذریعہ جلے ہوئے ایندھن سے مختلف عناصر الگ کر لئے جائیں اور ان کے جلنے کے دوران پلوٹونیم پیدا کی جائے۔

اس دوران فرانس سے جن شرائط پر ری پروسیسنگ پلانٹ حاصل کرنے پر اتفاق ہوا تھا اس کے تحت ہم پر اتنے تحفظات عائد کئے گئے تھے کہ پاکستان کے لئے ری پروسیسنگ پلانٹ سے علیحدہ شدہ پلوٹونیم کو کسی بھی طرح ہتھیار سازی کے مقاصد کے لئے استعمال کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ بایں ہمہ ہمیں امید تھی کہ ہماری سائنسدان برادری اس ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھائے گی۔ اس وقت ہم نے کچھ پاور ری ایکٹرز لگانے کے خواب بھی

دیکھے تھے جن کے لئے ری پروسیسنگ پلانٹ سے حاصل شدہ پلوٹونیم بطور ایندھن استعمال کیا جاتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ پاکستان پر ایٹمی ہتھیار بنانے کا راستہ حتمی طور پر بند ہو چکا تھا۔ پاکستان کے لئے تحفظات سے بچنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ایٹمی توانائی کے بین الاقوامی ادارہ کے تحفظات کے علاوہ فرانس کے بھی تحفظات تھے۔ اور پھر امریکہ کا دباؤ تھا کہ ری پروسیسنگ پلانٹ کے حصول کا خیال ترک کر دیا جائے۔ مسٹر بھٹو نے اس دباؤ کو ماننے سے انکار کر دیا تھا' مسٹر بھٹو کے محروم اقتدار ہونے کے بعد بھی یہ دباؤ جاری رہا اور اکثر امریکی سفیر پاکستانی حکام سے اس بارے میں ملاقاتیں اور مطالبے کرتے رہے۔ ان کا پہلا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ ہم فرانس کے ساتھ ری پروسیسنگ پلانٹ حاصل کرنے کا معاہدہ ختم کر دیں۔ اور ہم انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ ہم عالمی اور فرانسیسی پابندیوں کی موجودگی میں کسی طرح بھی ہتھیار سازی کے لئے پلوٹونیم حاصل نہیں کر سکتے بلکہ ہم نے یہ تک کہہ دیا ہے کہ ری پروسیسنگ پلانٹ سے حاصل کردہ وہ تمام فاضل پلوٹونیم فرانس واپس لے جائے صرف اتنی مقدار میں ہمارے پاس رہنے دے جو ایٹمی بجلی گھر چلانے کے لئے درکار ہو۔ اور اس کے لئے ہم عالمی ادارہ کے تحفظات قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ فرانسیسی وزیر خارجہ نے مجھ سے استفسار کیا کہ ری پروسیسنگ پلانٹ آپ کو کس لئے چاہیے؟ آپ اس کا کیا کریں گے؟ میں نے جواب دیا کہ ہم کئی ایٹمی بجلی گھر تعمیر کرنا چاہتے ہیں اس وقت ہم سعودی عرب سے ۶۰۰ ملین ڈالر قرضہ حاصل کرنے کی بات چیت کر رہے تھے' لیکن فرانس امریکی دباؤ پر سودے سے منحرف ہو گیا اور یوں پاکستان کے بھی ایٹمی طاقت حاصل کرنے کی کہانی ختم ہو گئی۔

۱۹۶۰ء کے عشرہ کے آخری سالوں میں جبکہ این پی ٹی پر مذاکرات جاری تھے اور جس کے تحت صرف پانچ ملکوں کو ایٹمی قوت تسلیم کیا جا رہا تھا جبکہ باقی تمام ممالک ہمیشہ غیر ایٹمی ممالک ہوں گے اور انہیں ایٹمی ہتھیار حاصل کرنے کے حق سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہونے اور اپنی تمام ایٹمی تنصیبات بین الاقوامی معائنے کے لئے کھولنے کے عزم کا اعلان کرنا تھا ہم نے افسر شاہی اور پھر سرکاری سطح پر حکومت پاکستان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ موقع ضائع نہ کرے ان دنوں فرانس سے ری پروسیسنگ پلانٹ صرف ۲۵ ملین ڈالر میں خریدا جا سکتا تھا اور معائنہ کی بھی کوئی شرط قبول کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ جس طرح بھارت نے ۱۹۶۰ کے عشرے کے پہلے سالوں میں ایٹمی پاور پلانٹ معائنہ وغیرہ کی شرائط کو منظور کئے بغیر حاصل کیا تھا لیکن ہماری حکومت نے اپنی عقل کے مطابق ہماری تجویز کو رد کر دیا۔ اس طرح ہم نے وہ موقع ضائع کر دیا جب مسٹر بھٹو برسر اقتدار آئے تو ہم نے اس تجویز کو دوبارہ زندہ کیا اور وہی ری پروسیسنگ پلانٹ ۲۵ ملین ڈالر کے بجائے ایک سو ملین ڈالر میں خریدنے کا معاہدہ کیا جبکہ اس کے لئے ہمیں انتہائی سخت تحفظات کو بھی قبول کرنا پڑا۔ لیکن ۱۹۷۶ میں یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ فرانس اس سودے سے انحراف کر رہا ہے بالآخر ۱۹۷۹ میں یہ سودا حتمی طور پر ہو گیا۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب ڈاکٹر خان آئے اور انہوں نے بتایا کہ یورینیم کی افزودگی کے لئے ''سنٹر فیوج پراسس'' بروئے کار لائیں گے۔ ایک دو سال کے اندر ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اس طرح ہم اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں اور انہوں نے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ آج اگر ہم پاکستان کو ایٹمی صلاحیت کا مالک ہے تو اس کے لئے ملک ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا ممنون احسان ہے اور یہ ان کی بدولت ممکن ہوا ہے۔

میں ڈاکٹر خان کے ساتھ کام کرنے والے تمام انجینئروں کو سلام کرتا ہوں' انہوں نے انتہائی زبردست کام کیا لیکن میں آپ کے سامنے حقائق بیان کر رہا ہوں چونکہ میں متعلقہ بورڈ سے وابستہ رہا ہوں اور میری ذمہ داری تمام غیر ملکی دباؤ کا سامنا کرنا تھا' جبکہ غلام اسحاق خان ڈاکٹر خان

کے لئے آرمی اور سول انجینئرنگ کی خدمات مہیا کرنا اور جناب اے.جی این قاضی کا اس کریش پروگرام کے لئے فنڈز مہیا کرنا تھا۔ یہ الگ کہانی ہے میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا لیکن میں اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ ہم پر بہت سے زیادہ دباؤ تھا۔

ہم پر یورینیم افزودگی کو ترک کرنے کے ساتھ ساتھ این پی ٹی پر دستخط کرنے کیلئے سخت دباؤ تھا لیکن بعد ازاں ہم نے واضح کر دیا کہ

ہم نے اقوام متحدہ کے اندر جنوبی ایشیا کو ''ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ'' (Nuclear Free Znoe) قرار دینے کے لئے بیس سال تک کوشش کی ہے لیکن بڑی طاقتوں کی طرف سے ہمیں اس بارے میں کوئی زیادہ تائید حاصل نہیں ہوئی اور بھارت نے اسے مسترد کر دیا حالانکہ اقوام متحدہ کے رکن ممالک کی بھاری اکثریت نے ہمیشہ ''جنوبی ایشیا کو ایٹم سے پاک علاقہ'' قرار دینے کی ہماری تجویز کی تائید کی۔ پھر ہم نے ۱۹۷۴ میں بھارت کے ایٹمی دھماکے کے بعد ایٹمی طاقتوں سے پاکستان کے لئے ایٹمی گارنٹی حاصل کرنے کی کوشش کی ہمیں ایٹمی چھاتہ درکار تھا۔ ہم ہر ایٹمی طاقت کے دروازے پر گئے لیکن ہمیں خالی ہاتھ لوٹایا گیا اسلئے ہم نے خود ایٹمی طاقت حاصل کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ دنیا میں کونسا ایسا ملک ہے جسے پاکستان سے زیادہ ایٹمی صلاحیت کی ضرورت ہو۔ ہم نے اپنا آدھا وطن محض اسلئے گنوا دیا کہ ہم وطن عزیز کا مناسب دفاع نہ کر سکے۔ دنیا کے کسی ملک کو سلامتی کے حوالے سے پاکستان جیسے مسائل کا سامنا نہیں ہے لہٰذا یہ دیکھنا عالمی طاقتوں کا کام ہے کہ پاکستان کے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کو وہ کس زمرے میں رکھتے ہیں؟ کیا وہ بھارت کی ایٹمی صلاحیت کو تسلیم کرنے پر تیار ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی مختلف حکومتوں نے اپنی تمام تر کمزوریوں کو تسلیم کے باوجود پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو مکمل تحفظ دیا اور اس کے لئے وہ سب قابل تحسین ہیں۔

گو اس سے پہلے بھی ڈاکٹر خان کے اعزاز میں دی گئی ضیافتوں میں کئی بار مجھ سے پوچھا گیا لیکن میں نے ہمیشہ احتیاط سے کام لیا لیکن اس موقع پر کہ جو ایک خصوصی تقریب ہے۔ میں ذاتی معلومات کی بناء پر نہایت مختصر انداز میں بتانا چاہتا ہوں کہ افزودہ یورینیم سے ایٹمی صلاحیت کس طرح حاصل کی اور اس میں ڈاکٹر خان کا کیا کردار ادا کیا۔ سچ یہ ہے کہ ڈاکٹر خان بلاشبہ کئی صلاحیتوں کے حامل اور کثیر الجہتی شخصیت ہیں۔''

قارئین! آپ نے اندازہ لگا لیا کہ محسن پاکستان کی ہمارے لئے کیا خدمات ہیں اور آج ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے میں اس کتاب کو نوجوانوں پر ایک فرض سمجھ کر لکھ رہا ہوں اور آپ نوجوانوں سے توقع رکھتا ہوں کہ آپ محسن پاکستان کی عزت وحرمت پر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ہمیں آج اس عزم کو یقینی بنانا ہوگا کہ ہم ڈاکٹر خان کی شخصیت پر زبان درازی کرنے والوں کو اس کی قطعاً اجازت نہیں دیں گے۔ اب آپ کی خدمت میں سابق ڈکٹیٹر رعونت کی انتہا کر دینے والے پرویز مشرف کی اس تقریر کو پیش کرتا ہوں جو اس نے ۲۷ مارچ ۲۰۰۱ء کو محسن پاکستان ڈاکٹر خان کی خدمات کے اعزاز میں دی گئی ایک ضیافت سے کی تھی۔ اس ضیافت میں بہت سے وزراء، افسران اعلیٰ، اعلیٰ فوجی جرنیل اور سائنسدان بھی شریک تھے۔ اپنی تقریر میں مشرف نے محسن پاکستان کی بے انتہا تعریف کی۔ لیکن بعد میں جب وہ امریکی غلامی تلے جھک گیا تو اس نے اپنے اسی محسن کے خلاف ایکشن لیا اور ڈاکٹر خان اور ان کے رفقاء جو بلاشبہ قومی ہیرو ہیں انہیں بدنام کیا۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے! خیر پرویز مشرف نے اس وقت جس طرح محسن پاکستان کو خراج تحسین پیش کیا ملاحظہ فرمائیں۔

محسن پاکستان کی خدمات کے اعتراف میں پرویز مشرف کی تقریر:

آج ہم یہاں وطن عزیز کے نہایت سینئر اور شہرہ آفاق سائنسدان اپنے قومی ہیرو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں تو میری سوچ پچیس مئی ۱۹۷۴ کے اس اہم دن کی طرف جاتی ہے جب بھارت نے اپنا پہلا ایٹمی دھماکہ کیا تھا اور جنوبی ایشیا کی سلامتی کے منظر کو بدلتے ہوئے پاکستان کے لئے انتہائی نامساعد صورت حال پیدا کردی تھی۔ ۱۹۷۱ میں پاکستان کے دولخت ہونے کے فوراً بعد اس واقعہ نے ہمارے عدم تحفظ اور جراحت پذیر ہونے کے احساس کو مزید گہرا کردیا تھا۔ ہمارے روایتی عدم توازن میں ایک اور سبب کا اضافہ ہوگیا تھا۔ اور پاکستان کو اپنی حفاظت کے بارے میں لاحق تشویش کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اس موقع پر عالمی برادری نے روایتی علامتی ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرلی تھی' پاکستان کو تن تنہا ہی بھارت کی ایٹمی بلیک میل اور دھمکیوں کا سامنا کرنا تھا۔ اور دوسری طرف ایٹمی ہتھیاروں کے پروگرام کا نام تک نہ تھا' ایسی صورتحال میں ہم پاکستانیوں کو صرف خدا ہی کا آسرا تھا۔ حقیقی معنوں میں مدد کے لئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے ہم نے ہمت نہ ہاری اور ہمارا عزم قائم رہا۔

آخر کار اللہ تعالیٰ نے قوم کی دعائیں سن لیں ہماری صورتحال پر رحم آگیا' اور ایک معجزہ رونما ہوا۔ پردہ غائب سے ایک بلند قامت اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل نابغہ کا ظہور ہوا اور یہ نابغہ روزگار ڈاکٹر عبدالقدیر خان تھے' ایسے نابغہ جنہوں نے تن تنہا قوم کو ایٹمی صلاحیت سے مالا مال کردیا۔ ان مشکل حالات میں ڈاکٹر خان کی آمد نے ایسی قوم کو جو اپنے مستقبل کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا تھی اور جو عمل کی بجائے خالی و خولی وعدوں اور جھوٹی سچی یقین دہانیوں کے بہلاوے کی عادی ہوچکی تھی اس کو امید رجائیت اور نیا حوصلہ اور اعتماد دیا۔

خواتین وحضرات! آنے والے سال' واقعات اور ڈاکٹر خان کی کامیابیاں ناقابل فراموش' ان مٹ اور پاکستان کی تاریخ کا عظیم الشان باب ہیں۔

ڈاکٹر خان اور ان کی ٹیم نے انتہائی مشکل حالات' رکاوٹوں' بین الاقوامی پابندیوں اور کربناک آپریشن کے علی الرغم اس حال میں اپنی شب وروز محنت شاقہ سے پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کا سرمایہ افتخار کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز جنہیں بعد میں بجا طور پر خان ریسرچ لیبارٹریز کا نام دیا گیا۔ ایسے عالم میں قائم کی کہ عملاً اس سے قبل کچھ بھی نہ تھا اور انہوں نے خالی ہاتھ کام شروع کیا تھا' پھر چند ہی سالوں میں انہوں اور ان کے جرات مند ساتھیوں نے ملک کو انتہائی افزودہ یورینیم کی صورت میں پہلا انشقاق پذیر مواد (بم) دیا۔ اور یوں سکور بھارت کے برابر کردیا۔ یہ کامیابی وکامرانی کی ایک لازوال داستان ہے۔ کہ وہ اپنی مادر وطن کے لئے ایک مقصد' ایک ہدف کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہوئے اور اپنی زندگی ہی میں اسے پایہ تکمیل کو پہنچتے دیکھا اور اپنے اہل وطن سے بے مثال خراج تحسین اور توصیف وصول کیا۔ اور قوم ان کی ہمیشہ کے لئے احسان مند اور مقروض ہوگئی۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے کہ اس سے قبل کوئی قوم کسی ایک فرد کی اس قدر کامیابیوں کی مرہون منت نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر خان کا دوبار نشان امتیاز حاصل کرنا ان کے منفرد پاکستانی ہونے کا ثبوت ہے وہ واحد پاکستانی ہیں جنہیں یہ اعزاز دوبار دیا گیا۔ اور یہ احسان مند قوم کی طرف سے ان کی عظمت واحسان کا اعتراف ہے اور وہ واقعتاً اس عزاز کے اہل ہیں۔

جناب ڈاکٹر صاحب! مجھے یہ بات رسمی طور پر ریکارڈ پر لانے کی اجازت دیجئے کہ آپ نے قوم کو جو کچھ دیا ہے اس کے لئے یہ قوم نہ صرف آج بلکہ آئندہ بھی ہمیشہ آپ کی ممنون احسان رہے گی۔ آپ ہمارے قومی ہیرو ہیں اور ہماری آئندہ نسلوں کے لئے مبداء فیضان ہیں۔ کوئی شخص بھی آپ سے یہ اعزاز چھین نہیں سکتا تاریخ میں آپ کا مقام متعین ہو چکا ہے۔ آپ ہمیشہ امر ہو گئے اور سرفہرست رہیں گے ہم آپ کو سلام کرتے اور اپنے دلوں کی گہرائی سے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

جیسا کہ اکثر کہتا ہوں ''مایوسیوں کے اتھاہ سمندر میں' پاکستان کا ایٹمی صلاحیت حاصل کرنا کسی قوم کی کامیابی وکامرانی کی بے مثال کہانی ہے۔ یہ بے لوث ایثار' بے قابو جذبہ خدمت سائنسی ذکاوت' فنی مہارت اور سب سے بڑھ کر ہزاروں خاموش کارکنوں کے جذبہ حب الوطنی اور حرارت ایمانی کی کہانی ہے۔ ان سائنسدانوں ان مجاہدوں نے پاکستان کو منفرد ایٹمی قوتوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ انہوں نے امت مسلمہ کو افتخار بخشا ہے۔ وہ پاکستانیوں کے بہترین نمائندہ ہیں۔ اور انہوں نے ثابت کر دکھایا کہ جب ہم ارادہ کر لیں تو پھر پہاڑوں کو بھی ہلا ڈالتے ہیں اور وہ اپنا رنگ بدل لیتے ہیں۔ یہ سب احساس فرض اور قوت ایمانی کا نتیجہ ہے۔

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ محسن پاکستان ڈاکٹر خان کا پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے میں کیا کردار تھا؟ آپ نے دیکھا محسن پاکستان ڈاکٹر خان کی کیا قدرت وقیمت تھی؟ قارئین تب کیا تھا؟ اب کیا ہے!!

قدرت کا انتقام

قارئین کرام! گزشتہ دنوں میں محسن پاکستان ڈاکٹر خان کے ہمراہ ان کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہوا تھا برادرم عبداللہ گل بھی موجود تھے ہم نے دیکھا کہ ڈاکٹر خان کی پالتو بلیاں اور کتا جس کا نام ''بیلا'' ہے بار بار ڈاکٹر خان کے پاس آتے ڈاکٹر خان انہیں کچھ کھانے کو دیتے اور ہم حیران ہوئے کہ ڈاکٹر خان جانوروں کو بھی بیٹا کہہ کر پکارتے تھے۔ ہم اس وقت بہت حیران ہوئے جب ڈاکٹر خان کے گھر کے سامنے واقع جنگل سے چند جانور نکل کر ان کے گھر کے صحن میں آئے اور محسن پاکستان کو سلام کرنے لگے۔ اس دوران ڈاکٹر خان نے ایک بندر کو جب بیٹا کہہ کر بلایا تو وہ ان کے قریب آکر ادب سے بیٹھ گیا۔ انہوں نے کیلے وغیرہ کھلائے۔ میں یہ دیکھ کر سوچنے لگا کہ ڈاکٹر خان کو نظر بند کرنے والا ظالم پرویز مشرف جو اس وقت فرعون بنا بیٹھا تھا۔ آج وہ وطن سے کوسوں دور در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے اور وہ خواہش کے باوجود وطن واپس نہیں آسکتا۔ اب تو وہ عدالت سے بھی اشتہاری قرار دیا جا چکا ہے لیکن محسن پاکستان اس کے ظلم کا نشانہ بننے کے باوجود آج اپنے گھر میں خدا کے معصوم فرشتوں (جانوروں) سے کھیل رہے ہیں۔ اور پوری قوم کے دلوں میں بستے ہیں۔

اب اسے خدا کا انتقام ہی کہا جا سکتا ہے کہ فرعون وقت دربدر ٹھوکریں کھا رہا ہے اور محسن پاکستان اپنے گھر' اپنے وطن' اور اپنی قوم کے درمیان موجود ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ ڈاکٹر خان کے خلاف شرمناک رویہ اختیار کرنے والا آمر ابھی مزید عبرت کا نشان بنے گا۔ ان شاءاللہ بے شک میرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش http://kitaabghar.com

باب ہشتم

شخصیت

کتاب گھر کی پیشکش http://kitaabghar.com

قارئین کرام! جیسا کہ گزشتہ ابواب میں یہ بات ثابت ہوگئی ہے۔ کہ وطن عزیز کے ایٹمی پروگرام کا سہرا اگر کسی ایک شخصیت سے باندھا جا سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف محسن پاکستان ڈاکٹر خان کی شخصیت ہے آیئے اب ہم اس باب میں فخر پاکستان جناب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے انکی شخصیت کا جائزہ لیں گے۔

محسن پاکستان ڈاکٹر خان بلا مبالغہ اس صدی کی سب سے بڑی شخصیت اور نفیس انسان ہے۔ مذہب کے حوالے سے انکا خصوصی لگاؤ ہے بلکہ انہیں زندگی میں جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوا وہ قرآن پاک اور احادیث رسول ﷺ سے رہنمائی لیتے ہیں۔ اور انتہائی حیرت کی بات ہے کہ محسن پاکستان ہر وقت باوضو رہتے ہیں، نماز ہمیشہ باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں لیکن چونکہ ان دنوں صرف اپنے گھر تک ہی محدود ہیں اس لئے اب ذاتی طور پر نماز کے اوقات میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے ڈاکٹر خان کے رفقاء کے مطابق نیوکلیئر پروگرام کے دنوں میں بھی شاید کوئی ایسا دن ہو کہ جب انہوں نے تہجد ادا نہ کی ہو۔ مغربی ممالک اور پاکستان کی اندورنی کہوٹہ دشمن لابی نے یہ پروپیگنڈا کھڑا کیا تھا کہ ڈاکٹر خان شراب کے رسیا ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے آج تک سگریٹ کو بھی منہ نہیں لگایا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان کبھی ایٹمی قوت نہ بن پاتا بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ وہ تو ہر وقت باوضو رہنے والے انسان ہیں تو ایسے شخص کے بارے میں شراب کا تصور ہی عبث ہے۔

ڈاکٹر خان جانوروں سے خاص انس اور محبت رکھتے ہیں۔ روزانہ صبح اور سہ پہر کے وقت انکے گھر کے سامنے واقع جنگل سے سینکڑوں بندر اور دیگر جانور آکر ان کے دروازے کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں انہوں نے اپنے گھر میں بھی ایک چھوٹا سا چڑیا گھر بنا رکھا ہے جہاں وہ خصوصی طور پر جانوروں کا خیال رکھتے ہیں۔ جانوروں سے انکا خصوصی لگاؤ اس حد تک ہے کہ وہ کسی جانور کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے اس ضمن میں ڈاکٹر نذیر احمد کا سنایا ہوا ایک واقع یاد آرہا ہے ڈاکٹر نذیر احمد بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم چند دوست پانی کے ایک تالاب کے پاس کھڑے تھے ہم نے دیکھا کہ تالاب میں سے ایک بھڑ تیر کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اس کوشش میں وہ کئی بار ڈوبا لیکن اس سے باہر نہیں نکلا جا رہا تھا ڈاکٹر خان نے یہ منظر دیکھ کر بھڑ کو ایک چھڑی کی مدد سے باہر نکالا اور اس کو دھوپ میں ڈال دیا تا کہ جب اسکے پر خشک ہو جائیں تو وہ اڑ جائے۔ اس دوران ہمارے ایک ساتھی نے اس خیال سے کہ کہیں یہ بھڑ ڈاکٹر صاحب کو نقصان نہ پہنچا دے بھڑ پر پاؤں رکھ کر اسے کچل دیا اس کے بعد ڈاکٹر خان اس ساتھی پر جس قدر طیش میں آئے آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں پر ایک اور بات واضح کرتا چلوں کہ ڈاکٹر خان اپنی پسند اور ناپسند کے حوالے سے بڑے سخت ہیں۔ جانوروں سے خصوصی شفقت کے حوالے سے ہی انہوں نے کبھی شکار کردہ پرندے کا گوشت نہیں کھایا بلکہ مختلف دوروں پر جب انکے لئے خصوصی طور پر پرندے شکار کر کے کھانا تیار کیا جاتا تو وہ اسکی بجائے بریڈ توسٹ اور چائے کو ترجیح دیتے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ دنیا کے مہلک ترین ہتھیار ایٹم

بم کا خالق اس قدر رحم دل ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے جونیئر کا بہت خیال رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ شفقت سے پیش آتے ہیں انہوں نے کبھی بھی اپنے کسی عام ورکر کو بھی اسکے نام سے نہیں بلایا کہ مبادا اسے احساس کمتری نہ ہو بلکہ مثلاً اگر کسی ورکر کا نام طاہر ہے تو وہ طاہر میاں یا طاہر بھائی کہہ کر بلائیں گے۔ اس سے ان کے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی دوران سفر وہ اپنے ڈرائیور کا خاص طور پر خیال رکھتے اور ہر گھنٹہ بعد اسے بریک ضرور دیتے تاکہ وہ چائے اور دیگر حاجات ضروریہ سے فارغ ہو جائے۔ ڈاکٹر خان کے پرنسپل سٹاف آفیسر میجر اسلام بتاتے ہیں کہ میں نے زندگی میں بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جو اپنے ورکرز کا اتنا خیال رکھتے ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ بلا کے ذہین ہیں بلکہ جس سے اگر ۳۰ سال پہلے بھی ملے ہوں تو اسے فوراً پہچان لیں گے۔ آپ زندگی کے ہر شعبہ میں کامیاب ترین انسان ہیں ڈاکٹر خان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی کو بھی مصیبت میں دیکھ کر اپنے تمام کاموں پر اسکی مدد کو ترجیح دیتے ہیں۔ بلکہ کسی کی مدد کر کے وہ بہت خوشی محسوس کرتے ہیں۔ میجر اسلام بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ نوائے وقت میں ایڈیٹر کی ڈاک میں ایک کالج میں پڑھانے والی خاتون کا مراسلہ شائع ہوا کہ اسکا ایکسڈنٹ ایک سرکاری گاڑی سے ہوا ہے اس کے پاس اتنی ہمت نہیں کہ وہ اپنی گاڑی کی مرمت کرواسکے لہٰذا متعلقہ محکمے سے مدد کی اپیل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے وہ مراسلہ پڑھ کر مجھے بلایا اور کہا کہ ''اسلام اس خاتون کی ہر ممکن مدد کرو'' پھر اس کے بعد ہم نے اس خاتون کو گاڑی ٹھیک بھی کروائی اور جتنے دن گاڑی ورکشاپ میں تھی اس کو متبادل گاڑی بھی فراہم کروائی۔ ڈاکٹر صاحب کے یہ اوصاف جلیلہ یقیناً ان کے بڑا ہونے کی دلیل ہیں اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جن سے ڈاکٹر خان کے انسانی ہمدردی کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر تعلیمی شعبے میں آپ ہر کسی کی مدد کرتے ہیں۔ میجر اسلام بتاتے ہیں کہ ''یہ ان دنوں کی بات ہے جب I-8 سیکٹر اسلام آباد میں مین روڈ پر دونوں اطراف میں جنگل ہوتا تھا۔ جس سے مختلف جانور نکل کر سڑک پر آجاتے تھے جس کی وجہ سے آئے روز ایکسڈنٹ ہوتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر خان نے CDA سے کہہ کر سڑک کے اطراف میں فینسنگ کروادی اور یوں اس مسئلہ کا ازالہ کیا۔ اسی طرح جب کہیں حادثہ ہوتا تو ڈاکٹر خان ہمیں کہہ کر لوگوں کی امداد کرواتے۔

قارئین کرام! پاکستان کے علاوہ بھی تمام اسلامی دنیا میں ڈاکٹر خان کا اس قدر احترام ہے کہ وہاں انہیں دیوتا کا درجہ دیا جاتا ہے۔ میجر اسلام ڈاکٹر خان کی شخصیت پر نظر ڈالتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ''ان جیسا کامل انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میں پہلے دن سے ان کے ساتھ تھا کہ جب وہ ابھی کہوٹہ کی سائیٹ سلیکشن کر رہے تھے۔ مجھے جی ایچ کیو سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ ڈاکٹر خان سے ان کے کام کے متعلق کوئی بات نہیں کرنی بس اپنی ڈیوٹی سے تعلق رکھنا ہے۔ نہ ہی ڈاکٹر خان نے مجھ سے کوئی بات کی کہ وہ کیا کرنے جارہے ہیں۔ البتہ میں نے اندازہ لگالیا کہ ڈاکٹر خان دفاع وطن کے لئے کوئی بہت بڑا کام کرنے جارہے ہیں۔ ان دنوں وہ سائٹ سلیکشن کررہے تھے۔ لیکن انہی دو ہفتوں میں انہوں نے ہمیں اتنا تیز کر دیا کہ ہم دن اور رات کا فرق کئے بغیر اپنے کام میں مگن ہوگئے۔ ہم منہ اندھیرے گھر سے نکل جاتے اور رات گئے تک واپس آتے۔ میں نے انہی ابتدائی دنوں میں یہ بھی اندازہ لگالیا کہ ڈاکٹر خان میں قائدانہ صلاحیتیں ہماری سوچ سے بھی زیادہ ہیں اور بعد میں یہ بات سچ ثابت ہوگئی۔ ڈاکٹر خان اپنے کام اور ٹارگٹ کے حوالے سے بڑے سخت بلکہ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ بڑے ضدی تھے۔ اگر انہوں نے کہہ دیا کہ فلاں دن اور فلاں وقت تک یہ کام مکمل ہونا چاہیے تو وہ اسے ہر حالت میں مکمل چاہتے تھے اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے اور اپنے جونیئرز سے کام لینے کا فن وہ بخوبی جانتے تھے۔ ان کی ایک عادت ہمیں بڑی پسند تھی کہ انہوں نے کبھی ہمیں یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ہم جونیئر اور وہ سنیئر ہیں بلکہ وہ

ہمارے ساتھ ہی اٹھارہ، بیس گھنٹے تک کام کرتے تھے تو پھر ہمیں کیا اعتراض ہے۔ان کی اسی عادت کی وجہ سے ہم بھی اپنا دن رات اور گھر بار بھلا کر اپنے مشن میں جت گئے۔کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کی بیگم آجاتیں اور کہتی کہ آپ نے کیا اپنے اور اپنے ساتھیوں کی نیندیں حرام کی ہوئی ہیں۔آپ اندازہ لگائیں کہ ہماری کئی عیدیں کہوٹہ ہی میں گذر گئیں۔اور ہمیں سوائے نماز عید ادا کرنے کے اور کوئی مسرت نہ ہوتی اور اس کے بعد ہم بھول جاتے کہ آج عید ہے۔اپنے مشن سے انکی وابستگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس دن ان کی والدہ کا انتقال ہوا وہ ایک اہم میٹنگ میں تھے، انہوں نے کہا کہ کسی کو نہ بتایا جائے جو اللہ کو منظور تھا وہ ہو گیا میں میٹنگ مکمل کر کے جاؤں گا اور یونہی ہوا۔

جب ہم سائٹ سلیکشن پر نکلے ہوئے تھے۔تو ڈاکٹر صاحب اکثر کہا کرتے تھے۔''کیپٹن صاحب دعا کریں کہ ہم جس کام کیلئے نکلے ہیں وہ مکمل ہو جائے پھر بھارت یا کسی اور ملک دشمن طاقت کو جرات نہ ہوگی کہ وہ ہم پر حملہ کر سکے۔وہ جب کبھی باہر سے بھی آتے تو گھر جانے کی بجائے پہلے دفتر میں جاتے اور اپنا کام نپٹا کر گھر آتے اور جب گھر آتے تو بھی اکیلے نہ آتے بلکہ فائلوں کا ایک ڈھیر انکے ساتھ ہوتا جس پر وہ ساری رات کام کرتے رہتے ہمیں ان کی آنکھوں سے اور ان کی فائلوں سے اندازہ ہو جاتا کہ وطن عزیز کا یہ عظیم سپوت اپنی نیندوں کو بھی دفاع وطن پر قربان کر رہا ہے۔ڈاکٹر خان کی بیٹیوں کے حوالے سے میں خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا کہ وہ مہذب اور تمیزدار اس قدر ہے کہ آپ اندازہ نہیں کر سکتے، ہمارا پہلے یہ تاثر تھا کہ شاید وہ ڈاکٹر خان کی شخصیت کی وجہ سے مغرور اور اکھڑ مزاج ہوں گی لیکن میں نے جب کبھی بھی انہیں بطور سٹاف آفیسر گھر رابطہ کیا اور ان کی بیٹیوں سے رابطہ ہوا تو ہمیں ان سے اتنی عزت ملی کہ آپ تصور نہیں کر سکتے۔ہمیشہ ان بچیوں نے ہمیں احترام دیا اور ہمیں بھی ڈاکٹر صاحب کی طرح عزت اور احترام دیا۔

ڈاکٹر خان صاحب وہ واحد شخصیت ہیں جنہوں نے ہر فورم پر وطن عزیز کے دشمنوں کی خباثتوں کا جواب دیا۔سب سے پہلے ڈاکٹر خان ہی نے مغربی ممالک کے متعلق کہا تھا کہ یہ لوگ پیسوں کی خاطر اپنی ماں کو بھی بیچ سکتے ہیں، اس پر مغربی ممالک نے بہت شور ڈالا بلکہ ٹائم میگزین نے ان کی تصویر کے ساتھ لکھا کہ یہ وہ شخص ہے جو ہمیں یہ بات کہہ رہا ہے، بہر حال ڈاکٹر خان ان چند شخصیات میں سے ہیں جو قوموں کے لئے سرمایہ افتخار اور عطیہ خداوندی ہوتے ہیں''

قارئین کرام! محسن پاکستان فخر پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی زندگی کا لمحہ لمحہ ہمارے لئے قابل نمونہ ہے، میں یہاں پر خاص طور پر نوجوانوں سے عرض کروں گا کہ وہ اپنے آپ کو اس قابل بنائیں کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے سپوت کہلائیں۔

مبین غزنوی

13/اپریل، 2011ء

76/A چکلالہ سکیم III، راولپنڈی

(اختتام)